

AL-AẒVĀ الاضواء
ISSN 2415-0444 ;E 1995-7904
Volume 34, Issue, 51 , 2019
Published by Sheikh Zayed Islamic Centre,
University of the Punjab, Lahore, 54590 Pakistan

جدید تفسیری ادب میں امین الخولیؒ کی امتیازی خدمات اور ان کا منہج واصول تفسیر: ایک تجزیاتی مطالعہ

Distinctive Approach of Amīn Khawlī in the Qur'ānic Exegesis: An Analytical Study

جمیل اختر*
مبشر حسین**

Abstract:
Amīn Khawlī, a 20th century Egyptian exegete, contributed to the Qur'ānic sciences from several important aspects as he introduced some particular principles for the interpretation of the Qur'ān. He was well acquainted with the prevailing methods and trends in the Qur'ānic exegesis (i.e., the Tafsīr literature), as he examined them in a scholarly manner. The methodological principles he identified for the Qur'ānic interpretation can be divided into two major categories: 1), subject-wise method of interpretation of the Qur'ān must be followed, which, according to him, is mostly ignored by the traditional scholars in their exegeses of the Qur'ān; and 2), the Qur'ān is revealed in the Arabic language so its linguistic dimension must be thoroughly observed in its interpretation, in particular, in case of disagreement of the opinions of the exegetes. al- Khawlī was of the opinion that the full command of the Arabic language can only guide the exegetes to reach the true and deeper meaning of the Qur'ānic text. Employing such principles, he offered a standard to settle the various disputes related to the interpretation of the Qur'ān. This paper deals with the exegetical contributions of al-Khawlī and articulates the principles introduced by the scholar under study in his writings. It also examines whether or not al- Khawlī's approach is in accordance with the Muslim tradition of the Qur'ānic study.

Key Words :Amīn Khawlī, Qur'ānic Exegesis, Contemporary Muslim Scholars

"تفسیر" ایک ایسا علم ہے جس میں قرآن کریم کے الفاظ کی دلالت کو سامنے رکھتے ہوئے انسانی استطاعت کے مطابق اللہ تعالیٰ کی مراد تک پہنچنے کی کوشش کی جاتی ہے۔[1] مفسرین قرآن نے ہر دور میں اپنی انسانی بساط کے مطابق قرآن مجید کی تفسیر کی ہے جس کے نتیجے میں ایک وقیع تفسیری ادب معرض وجود میں آیا اور یہ اس بات پر واضح دلالت ہے کہ تفسیرِ

* لیکچرر، شعبہ علوم اسلامیہ، یونی ورسٹی آف گجرات، گجرات
** اسسٹنٹ پروفیسر / صدر شعبہ حدیث وسنت، ادارہ تحقیقات اسلامی، بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی اسلام آباد، فل برائٹ اسکالر، ہارورڈ یونی ورسٹی، امریکہ

قرآن، مسلمانوں کے ہاں ہمیشہ سے ایک ایسا اہم علمی شعبہ رہا ہے جس میں انہوں نے ہر دور میں انتہائی دلچسپی کا مظاہرہ کیا ہے۔ مفسرین نے زمان و مکان کی ضروریات کو سامنے رکھتے ہوئے قرآن مجید کی مختلف زاویوں سے تفاسیر لکھیں، اس ضمن میں انہوں نے آپس میں بہت سے مقامات پر الفاظ کا معنی و مفہوم متعین کرنے میں اختلاف بھی کیا ہے۔ یہ اختلاف جو اصولی و منہجی بھی ہے اور جزوی و ضمنی بھی، علم تفسیر میں بہت سے رجحانات اور مناہج سامنے لایا جن میں سے ایک لغوی / لسانی / ادبی رجحان بھی ہے۔

قرآن مجید کا عربی زبان میں نزول ایک ایسی قوم میں ہوا جو عربی دانی میں معروف تھی۔ آج ساڑھے چودہ سو صدیاں گزرنے کے بعد بھی لوگ ان کے لکھے ہوئے قصائد دہراتے ہیں، ان کے خطبات کو یاد کرتے ہیں اور ان کی فصاحت و بلاغت کے قدر دان ہیں۔ اس کے باوجود اہل عرب قرآن کی فصاحت و بلاغت کے سامنے انگشت بدنداں تھے اور اس کے مقابلے کا جب انہیں چیلنج ملا تو وہ مقابلے کی ہمت نہ کر پائے۔[2] قرآن مجید کے لغوی و ادبی محاسن کی طرف ہر دور کے مفسرین نے توجہ کی ہے۔[3] اس نوعیت کی غالباً سب سے پہلی باقاعدہ کاوش ابو عبیدہؒ (م: ۸۲۴ء) کی ہے جو ماہر لسانیات تھے۔ انہوں نے ہر چیز کا مطالعہ کیا جس کا تعلق عرب کی تاریخ اور ثقافت سے تھا اوراس طرح عرب کی ثقافت اور زبان و ادب کو ایک جگہ جمع کر دیا۔ قرآن کے لغوی و ادبی پہلو پر ان کی تصنیف "مجاز القرآن"[4] کو پہلا تفسیری کام شمار کیا جاتا ہے۔[5] اپنی اس تصنیف میں انہوں نے سورتوں کی ترتیب کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے چند منتخب الفاظ اور جملوں کے معانی کے حوالے سے مختصر نوٹس لکھے ہیں۔ ابو عبیدہؒ کے چند ہم عصروں نے بھی اسی نہج پر تفسیر کی ہے جن میں قطربؒ (م: ۸۲۱ء)، الفراءؒ (م: ۸۲۲ء)، الکسائیؒ (م: ۸۰۵ء)، ابن حدیدؒ (م: ۷۸۶ء)، المفضل الضبیؒ (م: ۷۸۴ء) اور خلف النحویؒ (م: ۷۹۶ء) شامل ہیں، ان سب مفسرین نے معانی القرآن کے عنوان سے کام کیا ہے۔[6]

قرآن مجید کے لسانی پہلو پر اہل علم کی توجہ ہر دور میں برابر مرکوز رہی ہے۔ ماضی قریب میں بھی کئی اصحابِ لغت و بلاغت نے اس ضمن میں کافی غور و فکر کیا اور اس تفسیری رجحان / منہج کے لیے اصول و ضوابط مقرر کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔ عرب دنیا میں اس حوالے سے جن بڑے اہل علم نے کچھ کام کیا ہے ان میں ایک محمد عبدہ مصری (وفات: ۱۹۰۵ عیسوی) بھی ہیں۔ ان کے بعض شاگردوں نے بھی ان کے خیالات کو مختلف پہلوؤں سے آگے پھیلایا۔ ان کے بعد مصر ہی کی سرزمین سے جن لوگوں نے قرآن مجید کے لغوی و ادبی / بیانی منہج کی طرف توجہ مبذول کروائی، ان میں امین الخولی (وفات: ۱۹۶۶ عیسوی) کا نام بھی اہم ہے۔ انہوں نے اس موضوع پر جو خدمات سرانجام دیں ان میں سے ایک ان کی کتاب بعنوان: "مناهج التجديد في النحو والبلاغة والتفسير والأدب" بھی ہے۔ لیکن بدقسمتی یہ کہ ان کی مصروفیات نے ان کو اتنا وقت نہ دیا کہ وہ تفسیر پر کوئی مکمل کام پیش کر پاتے، ہاں البتہ تفسیر کے حوالے سے جو اصول انہوں نے وضع کیے تھے، ان اصولوں کی روشنی میں انہوں نے چند ایک تفسیری مضامین لکھے جو اولاً قاہرہ کے ریڈیو پر خطبات کے طور پر پیش ہوئے اور بعد میں ان کے یہ خطبات ایک کتابی شکل میں شائع بھی ہوئے جس کا عنوان "من هدي القرآن" رکھا گیا۔

امین الخولی کے کئی شاگردوں نے ان کے بیان کردہ اصولوں کی روشنی میں قرآن مجید کی تفسیر کی، ان میں سے ایک آپ کی ہونہار شاگردہ محترمہ عائشہ بنت الشاطیؒ بھی تھیں جن کا امین الخولیؒ سے نکاح ہو گیا۔ عائشہ بنتِ الشاطیؒ کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ انہوں نے قرآنیات میں امین الخولیؒ کے منہج کا انطباق ظاہر کرنے کی کوشش کی اور قرآنیات کے حوالے سے اپنی کئی تصانیف میں اس کو موضوعِ بحث بنایا۔ اس کے ساتھ انہوں نے استاد امین الخولیؒ کے اصولوں کو سامنے رکھتے ہوئے قرآن مجید کی بعض سورتوں کی باقاعدہ تفسیر بھی کی ہے۔ امین الخولیؒ نے تفسیرِ قرآن کا جو رجحان پیش کیا وہ ادبی رجحان کے نام سے معروف ہوا۔ اس رجحان کو باقاعدہ منظم طریقے سے پروان چڑھانے کے لیے کاوشیں کی گئی جس کے نتیجے میں ایک مکتبِ فکر وجود میں آیا جو مدرسہ بیانیہ کے نام سے جانا گیا۔ ڈاکٹر امین الخولی اس مدرسہ فکر کے بانی کے طور پر جانے جاتے ہیں۔ زیر نظر مقالہ میں امین الخولیؒ کی تفسیری خدمات، خصوصاً ان کے اصول تفسیر کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔

استاد امین الخولی کی ابتدائی زندگی اور تعلیم و تعلم:

آپ کا مکمل نام امین ابراہیم عبد الباقی عامر اسماعیل یوسف الخولی ہے۔ آپ ۱۸۹۵ء میں مصر کے ایک گاؤں شوشای میں پیدا ہوئے۔ (7) آپ کے والد محترم ابراہیم چونکہ زیادہ تعلیم یافتہ نہیں تھے اس لیے انہوں نے ازہر کو جلد ہی چھوڑ دیا اور گاؤں چلے گئے تاکہ وہ اپنے کھیتوں میں کام کر سکیں۔ آپ کے والد کی یہ کوشش تھی کی وہ اپنے ماحول کو اسلامی بنا سکیں اس لیے وہ جوانی میں نوجوانوں کی سی برائیوں سے دور رہے۔ ان کو گھڑ سواری اور آتش بازی کا شوق تھا، اسی لیے وہ آتشی اسلحہ اور قیمتی پتھر اکٹھے کیا کرتے تھے۔ امین الخولی نے اپنے والدِ محترم سے سچائی، راست بازی اور جرأت مندی کا سبق سیکھا اور اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے اپنے والد محترم سے گھڑ سواری بھی سیکھی۔ آپ کھیتوں کی کٹائی میں، لوگوں کی ضروریات پوری کرنے میں اور ان کے جھگڑوں کو نپٹانے میں اپنے والد محترم کی مدد کیا کرتے تھے۔ (8)

آپ کی والدہ کا نام فاطمہ تھا جو الشیخ علی عامر الخولی کی بیٹی تھی جنہوں نے جامعہ ازہر میں اپنی تعلیم مکمل کی اور علم قراءات میں تخصص کیا اور مسجد "جامع السلطان (شاہ) بعابدین" میں امام اور خطیب مقرر ہوئے۔ استاد امین الخولیؒ اپنے بچپن کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ سال ۱۹۰۲ء میں ان کو گاؤں سے لایا گیا اور ان کی نانا کی نگرانی میں انہیں ان کی خالہ کی گود میں ڈال دیا گیا۔ آپ کے نانا رشتہ میں آپ کے والد کے چچا بھی لگتے تھے اور وہ جامعہ ازہر کے شیخ تھے جنہوں نے اپنی، اپنے بیٹے (یعنی امین الخولی کے ماموں) اور اپنی بیوی کے بھائیوں کی زندگیاں جامعہ ازہر میں علم کی خدمت کے لیے وقف کر دی تھیں۔ چوں کہ امین الخولی اس وقت چھوٹے تھے، اس لیے ان کو شہر ہی کے ایک مدرسہ میں قرآن مجید حفظ کرنے کی غرض سے بھیج دیا گیا جہاں ابتدائی مرحلہ کی تعلیم دی جاتی تھی۔ لیکن آپ کے نانا اپنے شہر کے مدارس کی کارکردگی سے زیادہ مطمئن نہ تھے، اس لیے وہ خود بھی امین الخولی کے حفظ کا اہتمام کرتے تھے۔ انہوں نے امین الخولی کے ذمہ یہ کام سونپا تھا کہ وہ روزانہ قرآن مجید کا ایک بڑا صفحہ یاد کریں گے، چاہے جمعہ کا دن ہی کیوں نہ ہو۔ (9) آپ کو قرآن مجید کے نئے سبق کے ساتھ ساتھ روزانہ سابقہ یاد کیا ہوا سبق بھی دہرانا ہوتا تھا۔ آپ کے نانا نے آپ کو کچھ مہینوں میں حفص کی قراءت کے مطابق اچھی تجوید سکھا دی۔ وہ امین الخولی

کو روزانہ ایک ربع سبق پڑھایا کرتے تھے۔ آپ نے تجوید کے زمانہ میں کئی ایک کتابوں کے متن بھی حفظ کر لیے تھے جیسا کہ السنوسیہ، الکنز، الاجرومیہ، الالفیہ، اور اس کے ساتھ ساتھ سائنس اور حساب کا بتدائی علم بھی حاصل کر لیا۔ اس کے بعد آپ کو مدرسہ القیسونی میں پڑھنے کے لیے بھیج دیا گیا جہاں عثمانی خاندان کی بچیوں کو بھی تعلیم دی جاتی تھی۔ یہ مدرسہ فقہاء و عرفاء کے امتحانات کی تیاری کرواتا تھا اور مدرسین تیار کیا کرتا تھا۔[10]

آپ نے دس سال کی عمر میں ۱۹۰۵ء میں قرآن مجید بمع تجوید حفظ کر لیا تھا۔ آپ کا حافظہ بہت تیز تھا، اسی لیے آپ نے قرآن مجید حفظ کرنے کے ساتھ ساتھ بعض دینی متون وعبارات بھی زبانی حفظ کر لی تھیں۔ اب اصولی طور پر آپ کو جامعہ ازہر میں داخلہ لے لینا چاہیے تھا لیکن آپ کو وہاں کا ماحول پسند نہ تھا کیوں کہ وہاں پر سب کے ساتھ مساوی سلوک نہ ہوتا تھا۔ جامعہ کے طلاب (دینی تعلیم حاصل کرنے والوں) کو توچٹائیوں پر بٹھایا جاتا جب کہ مدارس کے بچوں (دنیاوی تعلیم حاصل کرنے والوں) کو لکڑی کی کرسیوں پر بٹھایا جاتا۔ آپ وہاں کی یہ حالت دیکھ کر ان سے متنفر ہو چکے تھے۔[11]

شیخ محمد السکری جو کہ آپ کی خالہ کے مکان میں رہتے تھے، وہ مدرسہ الحسینیہ میں پڑھاتے تھے۔ یہ ایک ابتدائی سطح کا مدرسہ تھا۔ امین الخولی شیخ محمد السکری کے پاس گئے اور مدرسہ الحسینیہ میں داخلہ لینے کے لیے ان کی مدد مانگی۔ جب آپ نے داخلہ کا امتحان دیا اور اس میں آسانی سے پاس ہو گئے تب اس مدرسہ میں پڑھنے کی آپ کی رغبت پہلے سے بھی زیادہ ہو گئی۔ جب آپ کے نانا نے یہ اعتراض کیا کہ جو کوئی قرآن مجید کو چھوڑ دے گا اللہ تعالیٰ اسے کبھی بھی کامیاب نہیں کرے گا تب امین الخولی نے یہی بہتر سمجھا کہ وہ اپنی اور اپنے نانا دونوں کی رغبت و خواہش کو پورا کریں اسی لیے انہوں نے مدرسہ الہامیہ (جس میں مشایخ ازہر کے شاگرد بھی تعلیم دیتے تھے) کا رخ کیا جس کے منتظم نے آپ کی ذہانت کے پیش نظر آپ کا اچھا استقبال کیا۔ لیکن جب آپ کو یہ پتہ چلا کہ یہ مدرسہ صرف طلبا کو تیار کر کے دوسرے مدرسے میں بھیجتا ہے تو آپ نے السیوفیہ کے علاقے میں موجود مدرسہ "عثمان پاشا ماہر" کا رخ کیا۔ جس کی عمارت بہت خوب صورت تھی اور اس کا صحن بے حد کشادہ تھا نیز ایک بڑی لائبریری بھی موجود تھی۔ آپ کی اہلیت کی وجہ سے آپ کو سال چہارم کے امتحانات میں بیٹھنے کی اجازت مل گئی۔ اس مدرسہ میں تعلیم کا دورانیہ پانچ سال تھا۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد آپ کو سندِ فراغت ملی جس میں لکھا تھا کہ مدرسہ "عثمان پاشا ماہر مرحوم" اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ طالب علم امین ابراہیم الخولی نے اس مدرسہ میں ایک ہونہار طالبعلم کے طور پر تین سال گذارے ہیں اور انہوں نے کوئی ایسا کام نہیں کیا جو کہ شرف و اعزاز سے خالی ہو۔[12]

مدرسہ "عثمان پاشا ماہر" سے فراغت کے بعد آپ کی یہ خواہش تھی کہ آپ مدرسہ دار العلوم میں داخلہ لیں لیکن مدرسہ "عثمان پاشا ماہر" کے شیخ عبد الرحمن خلیفہ نے آپ کو ترغیب دلائی کہ آپ مدرسہ قضاء میں داخلہ لیں اور اس کی یہ دلیل پیش کی کہ تم سے کم علم لوگ بھی اس مدرسہ میں گئے اور کامیاب ہوئے۔ آپ نے مدرسہ قضاء میں تعلیم حاصل کی اور بعد میں اسی میں تدریس کے فرائض بھی سرانجام دیئے۔ جون ۱۹۱۵ء میں امین الخولی بھی انہی معاصر علماء میں شامل ہو گئے جو اپنی داڑھی منڈواتے تھے۔ لیکن اسی سال کے ماہ اکتوبر سے آپ پر یہ لازم کر دیا گیا کہ آپ کی داڑھی میں کم از کم دو ہفتے کے

بال ہونے چاہئیں تا کہ آپ کو کوئی جرمانہ نہ ہو۔ آپ کو داڑھی رکھوانے کا مقصد یہ تھا کہ قضاء کے منصب کے مطابق آپ کی شخصیت باوقار معلوم ہو۔ [13] ۱۹۱۹ء میں آپ کے والد محترم اس دنیافانی سے کوچ کر گئے۔ [14]

استاد امین الخولی کی عملی زندگی:

آپ نے ۱۹۲۰ء میں مدرسہ قضاء کی تعلیم سے فراغت حاصل کی۔ آپ کی علمی فوقیت اس بات سے بھی ثابت ہوتی ہے کہ مدرسہ سے فراغت کے فوراً بعد آپ اسی مدرسہ قضاء میں نہ صرف فیکلٹی ممبر بنے بلکہ آپ نے اپنی نوکری کے ابتدائی دوسالوں میں اس فیکلٹی کے ایک مجلہ کی صدارت بھی کی۔ [15] صدہاافسوس کہ یہ مدرسہ زیادہ دیر تک چل نہ سکا اور ذمہ دار حضرات نے جلد ہی اس مدرسہ کو بند کر دیا۔ اس مدرسہ میں کام کرنے والے ملازمین کو کئی دوسری جگہوں پر بھیج دیا گیا۔ استاد امین الخولی کے حصے یہ سعادت آئی کہ آپ کو ۱۹۲۳ء میں روم میں موجود مصری کمیشن میں اور اس کے بعد برلن میں موجود مصری کمیشن میں بطور امام متعین کر دیا گیا۔ [16] آپ کو مغرب اور مغربی افکار کو نزدیک سے دیکھنے کا موقع ملا۔ [17] آپ نے وہاں پر قیام کے دوران اٹالین اور جرمن زبان سیکھی، نیز ان دونوں زبانوں کے ادب وافکار پڑھنے کا موقع ملا۔ [18] آپ ۱۹۲۷ء کو واپس مصر تشریف لے آئے تا کہ آپ بطورِ مدرّس خدمات سرانجام دے سکیں اور طلبا آپ کے بحرِ علمی سے مستفید ومستفیض ہو سکیں۔ لیکن اس سے اگلے سال ۱۹۲۸ء ہی میں آپ قاہرہ یونیورسٹی کی آرٹس فیکلٹی میں بطورِ لیکچرر بھیج دیئے گئے۔ [19] اگرچہ وہاں حالات کافی ناساز تھے، عربی زبان اور علوم عربیہ کی درس وتدریس میں ایک طرح کا جمود تھا۔ [20] تاہم آپ نے طلبا کو ایک نئی جہت سے متعارف کرایا، آپ طلبا کو ادبی جدت پسندی کی طرف لے کر آئے۔ [21] آپ نے عمومی طور پر جدید فنی مطالعہ اور بالخصوص جدید ادبی مطالعہ متعارف کروایا۔ آپ نے اس ضمن میں کئی ایک علمی مضامین بھی لکھے۔ جیسا کہ ۱۹۳۱ء میں "بلاغت وفلسفہ"، ۱۹۳۴ء میں "تاریخِ بلاغت میں مصر (کا کردار)"، ۱۹۳۹ء میں "بلاغت اور علم نفس"... بعینہ آپ نے ۱۹۳۸ء میں دائرہ معارف اسلامیہ کے لیے بلاغت کے مادہ پر ایک مستقل کتابچہ لکھا۔ [22] آپ ۱۹۲۸ء سے ۱۹۵۳ء تک قاہرہ یونیورسٹی میں تدریس کے فرائض سرانجام دیتے رہے۔ ابتداء میں آپ کو وہاں بطور لیکچرر بھیجا گیا تھا لیکن اس کے بعد آپ وہاں پر ایسوسی ایٹ پروفیسر بن گئے، سال ۱۹۴۶ء میں آپ اسی یونیورسٹی میں آرٹس فیکلٹی کے ڈین بن گئے، [23] اور کچھ ہی سالوں میں آپ عربی زبان اور مشرقی زبانوں کے شعبہ کے پروفیسر اور پھر وہاں کے ڈین بن گئے۔ آپ یہاں پر سال ۱۹۵۳ء تک اپنی خدمات سرانجام دیتے رہے اور اس کے بعد آپ مصری کتب خانوں کے ٹیکنیکل ایڈوائزر (Technical Advisor) بن گئے۔ [24]

آپ نے پوری دلجمعی کے ساتھ عربی زبان وبلاغت کا مادہ پڑھانا شروع کیا۔ آپ نے بڑی جرأت مندی سے بلاغت کے مسائل پر بحث کی، آپ نے قدیم نظریات کا جدید نظریات سے موازنہ کیا۔ آپ نے قدیم نظریات کو جدید طرز سے پیش کیا۔ آپ سے پہلے یونیورسٹی میں یہ طریقہ رائج نہ تھا۔ آپ نے بلاغت کا مادہ مکمل تفصیل بمعہ اس کی اقسام کے

پڑھایا۔ آپ ایک سال بلاغت کے جو موضوعات پڑھاتے تھے آئندہ سال ان موضوعات کے علاوہ دیگر موضوعات پر بحث کرتے تھے۔ آپ سابقہ موضوعات کو نہیں دہراتے تھے الّا یہ کہ طالب علموں کی طرف سے ایسا کوئی مطالبہ سامنے آ جائے۔(25) استاد امین الخولی لکھتے ہیں:

" وزارتِ معارف نے یہ خواہش ظاہر کی کہ وہ ثانوی مدارس کے اساتذہ کو ایک خاص ڈگر پر چلائیں اور وہ ان کے تدریسی مواد میں جدید رجحان یا جدید طرز کی تبدیلی لائیں۔ اس مقصد کے حصول کے لیے انہوں نے "معهد الدراسات العليا" کے نام سے ایک ادارہ بنایا تا کہ وہ اس ادارے میں شام کی کلاسوں کا اجراء کریں۔ وزارتِ معارف نے مجھ سے یہ وعدہ لیا کہ میں اس معہد میں بلاغت کا مادہ پڑھاؤں، مجھے ادبی جدت پسندی کے افکار کو عملی طور پر کامیاب بنانے کے بہترین مواقع مل گئے۔ کیونکہ جن لوگوں کو اس ادارے میں بلایا گیا تھا وہ اساتذہ کرام تھے...(تاہم ایک مسئلہ ضرور تھا کہ) اس کورس کا دورانیہ بہت مختصر تھا؛ ہر ہفتے میں صرف دو دن کے لیے شام کی کلاسز ہوتی تھیں جن میں تین کورسز پڑھائے جاتے تھے اور یہ کلاسز دو سال تک چلتی تھیں۔ ہر سال میں سے آدھا سال گرمیوں کی چھٹیوں اور امتحانات میں گزر جاتا۔ اس ادارے میں بلاغت کا مادہ ان دو سالوں میں صرف اور صرف ایک سو گھنٹے کے لیے پڑھایا جاتا تھا۔ اس مختصر وقت میں یہ ہرگز ممکن نہ تھا کہ بلاغت کے تمام مسائل پر بحث کی جاتی اور ان مسائل کو تفصیل سے حل کیا جاتا... لیکن اس سب کے باوجود پھر بھی اس بات کی کوشش کی گئی کہ قدیم اور جدید ادبی نظریات کا تقابل کرتے ہوئے جدید طریقہ کار کا انطباق کیا جائے۔ یہ ایسا طریقہ کار تھا جو اس ادارے میں لیکچرز دیتے ہوئے میں نے اختیار کیا اور پڑھنے والوں نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ ان ادبی لیکچرز کو کتابی شکل میں لایا جائے، اس کے لیے انہوں نے خود ہی کوشش کی اور مدرسہ امناء کے اصحاب نے اس ضمن میں ان کی بھرپور مدد کی۔"(26)

۱۹۶۱ء میں آپ قاہرہ کے مجمع اللغہ العربیہ کے رکن منتخب ہوئے۔ (27) اور اس بات میں کوئی شک نہیں کہ انہوں نے ڈاکٹر امین الخولی کی صحیح معنوں میں قدر کی۔(28) آپ نے بھی اس کمیٹی میں دلجمعی سے مشارکت کی اور بہت سی عمدہ بحوث پر قلم اٹھایا۔ آپ اپنی آخری عمر تک اس کمیٹی میں خدمات سرانجام دیتے رہے۔(29)

استاد امین الخولیؒ کی تصنیفی خدمات:

جس طرح آپ کو درس و تدریس کا بہت شوق تھا بعینہ آپ کا تالیف کے میدان میں بھی شغف تھا۔ آپ نے اپنی زندگی میں مختلف علوم و فنون پر قلم اٹھایا۔ آپ کی تالیفات دیکھ کر پتہ چلتا ہے کہ آپ کو تالیف میں ملکہ حاصل تھا۔ آپ نے عربی لغت، ادب، بلاغت، عربی گرائمر اور قرآنی تفسیر کے موضوعات پر بہت سی ابحاث و مقالات لکھے جو کہ مختلف علمی رسائل میں شائع ہوئے جن میں آرٹس فیکلٹی، ہفت روزہ سیاست، الرسالہ، عربی اور ادبی مجلات شامل ہیں۔ دائرہ معارف اسلامیہ میں تصحیح کی غرض سے بھی آپ نے تعلیقاً کافی کچھ لکھا۔(30)

ڈاکٹر کامل احمد سعفان کا یہ کہنا ہے کہ استاد امین الخولی کو لکھنے کا شوق تاریخی ڈارمے دیکھنے سے پیدا ہوا۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے استاد امین الخولیؒ سے پوچھا کہ آپ کی پرورش جس ماحول میں ہوئی وہاں ڈرامہ دیکھنے کا رواج نہیں ہے، آپ کو یہ شوق کہاں سے پیدا ہوا تو انہوں نے جواب دیا کہ میں پہلی مرتبہ ۱۹۱۱ء میں تھیٹر گیا، میں نے "تیاترو الازبكة" میں جورج کو دیکھا جو کہ لویس الیون کا بہروپ اپنائے ہوئے تھا۔ اس ڈرامے نے مجھ پر غور و فکر کی نئی راہیں کھولیں۔ ڈاکٹر کامل احمد سعفان کے بقول ڈاکٹر عائشہ بنتِ الشاطیؒ کا بھی یہ کہنا ہے کہ آپ ہمیشہ تھیٹر کو اچھا سمجھتے رہے لیکن آپ کبھی کبھار ہی سینما جایا کرتا تھے جب کبھی کوئی اہم فلم ہوتی تب تو آپ اسے لازمی دیکھتے۔ آپ پہلی مرتبہ اپنے کسی دوست کے اصرار پر تھیٹر گئے تھے کیوں کہ آپ جس ماحول میں رہ رہے تھے اس میں ساز و موسیقی کو حرام سمجھا جاتا تھا۔ لیکن اس کو دیکھنے کے بعد آپ کی قصص و تاریخ کی طرف رغبت زیادہ ہو گئی۔ آپ بازار سے قصے کہانیوں کی کتابیں خرید کر پڑھا کرتے تھے، اپنے نانا کی لائبریری سے تاریخ کی کتب لے کر پڑھا کرتے تھے، اس کے علاوہ شعراء کو بھی پڑھا کرتے تھے۔ آپ وقتاً فوقتاً دار الكتب المصریہ بھی جایا کرتے تھے اور اپنے علم کی پیاس بجھایا کرتے تھے۔[31]

استاد امین الخولیؒ نے تھیٹر کو وقت گزاری کا مشغلہ نہیں بنایا بل کہ اسے اپنی تحقیقی کتابت میں عملی طور پر منطبق کیا۔ آپ نے مدرسہ القضاء الشرعی میں پڑھتے ہوئے سال ۱۹۱۶ء میں دو کاپیوں پر محیط "السياحات الإسلامية" کے عنوان سے ایک بحث لکھی اور اس میں آپ نے عربی کے اصل مصادر سے مواد اکھٹا کیا جیسا کہ ابو الحسن علی بن حسین بن علی مسعودیؒ (م:۹۵۷ء) کی تصنیف "مروج الذهب ومعادن الجواهر"، محمد بن عبد اللہ بن محمد بن ابراہیم ابن بطوطہ (م:۱۳۷۸ء) کی "رحلة ابن بطوطة المسماة تحفة النظار في غرائب الامصار وعجائب الأسفار"، محمد بن احمد بن جبیر الكناني الأندلسيؒ (م:۱۲۱۷ء) کی "رحلة ابن جبير"، ابن خرداذبہ (م:۹۱۲ء)، ابو القاسم عبید اللہ بن عبد اللہ کی "المسالك والممالك"، ابو اسحاق ابراہیم بن محمد الفارسي الاصطخري (م:۹۵۷ء) کی "مسالك الممالك"، قدامہ بن جعفر بن قدامہ بن زیاد البغدادي کی "الخراج وصناعة الكتابة"، اور ابو عبد اللہ محمد بن احمد المقدسی البشاری (م:۹۹۰ء) کی "أحسن التقاسيم في معرفة الأقاليم"۔ یہ تحقیقی بحث مجلہ "الهلال" میں شائع ہوئی جس کے بارے میں اس مجلہ کے ایڈیٹر نے لکھا کہ یہ بحث بہت اہمیت کی حامل اور عمدہ ہے جسے استاد امین الخولی نے لکھا ہے، انہوں نے مصادرِ اصلیہ سے تمام مواد اکھٹا کیا، اس کو عمدہ طریقے سے ترتیب دیا اور پھر اسے بہترین طریقے سے پیش کیا۔[32]

آپ نے "السفور" نامی جریدہ میں بھی لکھنا شروع کیا جس میں لکھنے والے محمد حسین ہیکلؒ (م:۱۹۵۶ء)، مصطفی عبد الرزاقؒ (م:۱۹۴۷ء)، منصور فہمیؒ (م:۱۹۵۹ء) اور احمد امین مصریؒ (م:۱۹۵۴ء) جیسے لوگ تھے۔ انقلاب کی آگ بھڑکانے میں اس جریدہ نے چنگاری کا سا کام کیا۔ اسی طرح جب آپ مدرسہ القضاء الشرعی میں تدریس کے فرائض سرانجام دے رہے ہیں تب آپ کی کتابت کی مہارت کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے آپ کو اس مدرسہ کے مجلہ کی صدارت بھی سونپ دی گئی حالاں کہ بہت سے لوگ خود اس مجلہ کی صدارت کے طلب گار تھے۔ اس بات سے آپ کی کتابت اور آپ کی انتظامی قوت

کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔[33] سال ۱۹۳۳ء میں جب "الرسالة" نامی مجلہ شروع ہوا تب استاد امین الخولیؒ بھی اس کے لکھاریوں میں سے تھے۔ انہوں نے اس میں "التجديد في الدين" کے عنوان سے اپنا مقالہ لکھا۔[34]

استاد امین الخولیؒ نے بہت سے اسلامی موضوعات و مسائل پر قلم اٹھایا، آپ کے ایسے مضامین مختلف اخبارات کی زینت بنتے رہتے تھے یا مختلف ریڈیو چینلز سے نشر ہوتے رہتے تھے۔ ان میں سے چند ایک یہ ہیں: "القادة و الرسل"، "في أموالهم" اور "في رمضان" وغیرہ۔ اس کے علاوہ آپ نے موسوعہ "دائرة المعارف الإسلامية" میں موجود مستشرقین کی ابحاث پر تعلیقات بھی لکھیں۔[35]

آپ نے عربی لغت، عربی ادب، اسلامیات، اخلاقیات اور فلسفہ پر کافی کچھ لکھا، آپ نے بہت سی کتابیں لکھیں جن میں سے چند درج ذیل ہیں: [36]

- كناش في الفلسفة وتاريخها
- تاريخ الملل والنحل
- فن القول
- مناهج تجديد فى النحو والبلاغة والتفسير والأدب
- في الأدب المصري: فكرة ومنهج
- البلاغة العربية وأثر الفلسفة فيها
- صلة الإسلام بإصلاح المسيحية
- مشكلات حياتنا اللغوية
- رأي في أبى العلاء
- الجندية والسلم: واقع ومثال
- صلات بين النيل والفولجا
- مالك: تجارب حياة في سلسلة أعلام العرب
- المجدودون في الإسلام
- من هدى القرآن: القادة و الرسل
- من هدى القرآن: في أموالهم
- من هدى القرآن: في رمضان

مذکورہ بالا علمی سرمایہ کے علاوہ بھی آپ نے تفسیر اور ادب و بلاغت کے حوالے سے کافی لکھا، آپ کے مضامین مختلف مجلات میں شائع ہوتے رہے جن میں سے چند ایک مجلات یہ ہیں: "كلية الآداب"، "السياسة الأسبوعية"، "الرسالة"، "العربي"، "المقتطف" اور "الأدب" وغیرہ۔[37] آپ کی بعض تصنیفات میں ایسی جدت اور عمدگی ہے جو کہ اس سے پہلے کسی اور کی تصنیف میں نہیں دیکھی گئی، مثال کے طور پر آپ نے راویوں کے حالاتِ زندگی ایسے انداز سے

بیان کیے ہیں کہ آپ سے پہلے کسی نے ویسا قلم نہیں اٹھایا۔ اس کی واضح مثال آپ کا امام مالک بن انسؒ(م: ۷۹۵ء) کے حالاتِ زندگی بیان کرنا ہے۔[38] اسی طرح آپ نے بلاغت کے حوالے سے جو کلام کیا ہے وہ بھی آپ کی مصنفانہ جدت کی مثال آپ ہے۔[39]

استاد امین الخولیؒ اور مدرسہ ادبیہ:

آپ کو اپنے علاقے کی اصلاح و بہتری کا بے حد خیال تھا جس کے لیے آپ اپنی کتابت کے ذریعے بھی کوشش کرتے رہتے تھے۔ ۱۹۴۳ء میں آپ نے باقاعدہ ایک جماعت کا اعلان کر دیا جو کہ مدرسہ "الأمناء: مدرسة الفن والحياة" کے نام سے جانی جاتی ہے۔[40] جماعت الامناء کے اصول و ضوابط میں لکھا ہے کہ یہ جماعت قاہرہ شہر میں بنائی گئی۔ جس کا مرکزی دفتر "العجم" روڈ (جو کہ اب امین الخولی روڈ کے نام سے جانا جاتا ہے) پر واقع تھا۔ جماعت کا مونوگرام اس طرح سے بنایا گیا کہ مصری کنول کا پھول اور اس میں لفظ "الأمناء"، لکھا گیا، اس جماعت کے کئی ایک اہداف و مقاصد طے کیے گئے، جیسا کہ جماعت کے کسی ممبر کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ سیاسی معاملات اور مذہبی عقائد کے حوالے سے لڑائی جھگڑوں میں پڑے۔ اسی طرح اس میں یہ بھی لکھا گیا کہ ہر ایسے ممبر کی رکنیت منسوخ کر دی جائے گی جو (۱) معزز نہیں، (۲) اگر اس نے ایسا کوئی کام کیا جس سے جماعت کو مادی یا ادبی لحاظ سے کوئی نقصان ہو، یا (۳) وہ جماعت میں محض اپنے کسی ذاتی مقصد کی خاطر شامل ہوا۔[41] جماعت کے مقاصد کو عملی جامہ پہنانے کے لیے اہلِ جماعت نے ۱۹۵۶ء میں "الأدب" نامی ایک مجلہ بھی نکالنا شروع کیا جس کی صدارت بھی استاد امین الخولیؒ ہی کے حصے آئی۔[42] آپ نے حکومتی نوکری سے ریٹائرڈ ہونے کے بعد یہ مجلہ شروع کیا، اس کا غرض محض یہ تھا کہ معاشرے میں جماعت "الامناء" کی نمائندگی کر سکے جس کا مقصد معاشرے میں ایسے نوجوان تشکیل دینا تھا جو کہ باعزت ہوں اور عزت والی زندگی کو ترجیح دیں، اپنی روحوں کو برائیوں سے پاک کریں اور اپنے دلوں کا تزکیہ کریں۔[43]

استاد امین الخولیؒ کی قومی و بین الاقوامی علمی حیثیت:

استاد امین الخولیؒ قومی و بین الاقوامی سطح پر ایک بڑے محقق کے طور پر معروف ہوئے۔ آپ کے علمی قد و کاٹھ کی اہمیت تسلیم کرتے ہوئے بہت سی علمی و ادبی اداروں / انجمنوں نے آپ کو اپنا ممبر بنا رکھا تھا، ان میں سے چند ایک درج ذیل ہیں:[44]

- لجنة القانون والإقتصاد
- لجنة معجم ألفاظ القرآن الكريم
- لجنة الأصول
- لجنة الأدب
- لجنة المكتبة

آپ نے اپنی زندگی میں کئی بیرونی علمی دورے کیے اور بین الاقوامی علمی کانفرنسوں میں شمولیت بھی کی، ان میں سے چند ایک درج ذیل ہیں:[45]

- ۱۹۳۶ء میں آپ نے تاریخ ادیان کے حوالے سے بیر وکسل میں ہونے والی چھٹی بین الاقوامی کانفرنس میں مصر کی نمائندگی کی۔
- ۱۹۵۷ء میں آپ نے میونخ میں ہونے والی مستشرقین کی بین الاقوامی کانفرنس میں شرکت کی۔
- ۱۹۶۰ء میں آپ نے ماسکو میں ہونے والی مستشرقین کی بین الاقوامی کانفرنس میں شرکت کی۔

امین الخولیؒ کی وفات:

۹ مارچ ۱۹۶۶ء بروز بدھ بعد از نمازِ ظہر آپ اپنے مریدین اور طلبا کو اس دنیا فانی سے الوداع کہہ گئے اور اپنے خالقِ حقیقی سے جاملے، اس وقت آپ کی عمر ۷۱ سال تھی۔ آپ کی پوری زندگی آپ کی ان تھک محنت کی گواہ ہے۔[46] آپ کو آپ کے گاؤں شوشای میں دفنایا گیا۔

امین الخولیؒ کی تفسیری خدمات:

استاد امین الخولیؒ کو جب مصر کی یونی ورسٹی میں قرآنی علوم پڑھانے کا موقع ملا تب انہیں وہاں کے طلبا میں تفسیر کے حوالے سے ایک جمود دیکھنے کو ملا۔ انہوں نے جلد ہی محسوس کر لیا کہ یہ سب روایتی نظامِ تعلیم کا نتیجہ ہے کہ اساتذہ اپنے طلبا کو روایتی انداز سے علم تفسیر پڑھارہے تھے۔ استاد امین الخولیؒ نے قرآن مجید کی تفسیر کے حوالے سے طلبا میں ایک نئی جہت متعارف کرائی۔ جس میں انہوں نے عربی زبان و ادب سیکھنے پر زور دیا اور یہاں تک کہا کہ جب تک ہم قرآن مجید کا عربی کی ایک عظیم کتاب کے طور پر مطالعہ نہیں کریں گے ہم قرآن مجید کے حقیقی معانی کو سمجھنے اور اس کی صحیح تفسیر کرنے کے قابل نہیں ہوسکتے۔ انہوں نے اس ضمن میں ریڈیو پر بھی کئی لیکچرز دیئے، انہوں نے قرآنِ مجید کی تفسیر کے حوالے سے اپنے وضع کردہ کئی اصول بیان کیے۔ چونکہ یہ اصول ان کے اپنے ذہن کی اختراع تھے اس لیے اس حوالے سے انہیں کافی تنقید کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ استاد امین الخولیؒ کے بقول طلبا ہی مستقبل کا سرمایہ ہیں اس لیے انہوں نے طلبا کو دعوت دی کہ وہ اپنی صلاحیتوں کو روایتی منہج پر صرف کرنے کی بجائے اس میں جدت و ندرت لائیں اور تفسیرِ قرآن کو نیا رنگ دیں۔ کئی طلبا اور اساتذہ آپ کی اس رائے سے متاثر ہوئے کہ قرآن مجید کی تفسیر کو نئی جہت دینی ہی چاہیئے اور اس ضمن میں انہوں نے استاد امین الخولیؒ کے بیان کردہ اصولِ تفاسیر سے استفادہ کرتے ہوئے قرآن مجید کی تفسیر کے حوالے سے کچھ عملی کام بھی کیا۔ آپ نے قرآن مجید کی تفسیر میں نئی جہت متعارف کرانے کے لیے عربی زبان و ادب اور خاص طور پر عربی بلاغت پر سب سے زیادہ زور دیا۔ آپؒ لکھتے ہیں: "میں اس مشکل موضوع کے درپے ہوا، میں بلاغت کے مسائل کو بڑی جرأت مندی اور حوصلے سے زیرِ بحث لاتا رہا۔ میں نے قدیم (اصول وضوابط) کا جدید (منہج) کے ساتھ موازنہ کیا، میں نے قدیم منہج میں نکھار پیدا کیا، اس میں سے عمدہ چیزوں کو جدید منہج کے ساتھ ملادیا۔"[47]

آئندہ صفحات میں الخولیؒ کی تفسیری خدمات کو دو حصوں میں تقسیم کر کے زیر بحث لایا جائے گا۔ پہلے حصہ میں آپ کے اس تجزیہ و تبصرہ پر بات کی جائے گی جو آپ نے تفسیر اور مناہج تفسیر کے ضمن میں کیا ہے اور دوسرے حصہ میں آپ کے اصول تفسیر پر بات کی جائے گی۔

1۔ تفسیر اور اس کے مختلف اسالیب و مناہج پر امین الخولی کا تبصرہ و تجزیہ

(1۔1) علم تفسیر:

"**تفسیر**" کے معنی و مفہوم کی وضاحت میں الخولیؒ فرماتے ہیں کہ "**ف س ر**" اور "**س ف ر**" یہ دونوں مادہ جات کشف کے معنی میں مستعمل ہیں، البتہ لفظ "**السفر**" سے مراد مادی و ظاہری کشف ہے جب کہ "**الفسر**" سے مراد معنوی و باطنی کشف ہے۔[48] لفظ تفسیر کا اطلاق ان شروحات پر بھی ہوتا ہے جو سائنسی اور فلسفیانہ تالیفات کی وضاحت میں لکھی جاتی ہیں۔ اس لفظ کے مترادفات میں سے ایک لفظ "**شرح**" بھی ہے۔ اس لفظ کا اطلاق ان شروحات پر ہوتا ہے جو کہ ارسطو(م:۳۲۲ق م) کی تالیفات کی یونانی اور عربی زبان میں (شروحات) پیش کی گئیں۔ بطورِ مثال کئی ایک 'تفاسیر' بیان کی جاسکتی ہیں جیسا کہ ابو الوفا البوزجانیؒ(م:۹۹۸ء) کی تفسیر جو کہ انہوں نے دیوفنطس اور الخوارزمی کی الجبرا پر لکھی جانے والی دو مشہور کتابوں کی وضاحت میں پیش کی... اسی طرح کئی ایسی کتابیں جو کہ علومِ عربیہ کے حوالے سے لکھی گئیں اور پھر بعد میں ان کی وضاحت کے لیے ان کی عربی زبان میں 'تفاسیر' لکھی گئیں۔[49]

الخولیؒ کے بقول اسلامی اصلاحات میں لفظ "**التفسیر**" کی وضاحت کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ اس سے مراد اللہ تعالیٰ کے کلام کی وضاحت کرنا ہے: یعنی "تفسیر" قرآن مجید کے الفاظ کے معنی و مفہوم کی وضاحت کا نام ہے۔ بعض لوگوں نے اس کی تعریف میں تکلّف برتتے ہوئے اس میں تفسیر سے ہٹ کر کئی دوسرے علوم بھی شامل کر دیئے ہیں جیسا کہ قراءات کا علم یا پھر ایسے علوم جن کی قرآن فہمی میں ضرورت ہوتی ہے جیسا کہ صرف و نحو اور بیان وغیرہ کا علم۔[50] الخولیؒ کی رائے میں ابنِ خلدونؒ (م:۱۴۰۶ء) کا یہ موقف: "قرآن مجید کا نزول عرب کی زبان (عربی) میں ہوا، اس کا اسلوبِ بیان اہلِ عرب کی بلاغت کے اسلوب کے مطابق تھا، اہلِ عرب سب کے سب اس قرآن کو سمجھتے تھے اور قرآن مجید کے مفردات اور تراکیب کو جانتے تھے"[51]، محل نظر ہے۔ ان کے بقول ابنِ خلدونؒ کی اس رائے کہ "تمام اہلِ عرب اس قرآن مجید کو یکساں درجہ میں سمجھتے تھے"، کی متقدمین کے ہاں بھی نفی ملتی ہے جیسا کہ ابنِ قتیبہؒ(م:۸۸۹ء) نے اپنے رسالہ "**المسائل والاجوبة**" میں کہا کہ قرآن مجید کے فہم میں تمام اہلِ عرب کی سمجھ بوجھ ایک جیسی نہیں تھی کیونکہ قرآن مجید میں غریب و متشابہات بھی ہیں، جبکہ بعض اہلِ عرب قرآن مجید کو دوسروں سے زیادہ اچھی طرح سمجھتے تھے۔[52]

(1۔2) تفسیر بالماثور:

تفسیر بالماثور یعنی: "ایسی تفسیر جو قرآن مجید، سنتِ رسول یا کلام صحابہ سے ثابت ہو، لہذا تفسیر بالماثور یا تو قرآن کی قرآن کے ذریعے تفسیر ہوگی یا حدیث نبوی ﷺ کے ذریعے ہوگی یا صحابہ کرامؓ سے منقول اقوال پر مبنی ہوگی"[53]، کے

لیے الخولیؒ نے تفسیرِ توقیفی [54] کی اصطلاح بھی استعمال کی ہے اور ان کا کہنا ہے کہ جتنے بھی متقدمین مفسرین نے قرآن مجید کی تفسیر کی ہے، انہوں نے تفسیرِ توقیفی پیش کی ہے۔ اس لیے سب سے پہلے جو تفسیر سامنے آئی وہ روایتی، نقلی یا اثری تفسیر کہلاتی ہے۔ اس طرح کی تفسیر کرنے کا سب سے ابتدائی اعزاز محدثین کرام کو جاتا ہے۔ [55] اس طرح تدوینِ حدیث کی تاریخ کے ساتھ ساتھ تفسیر کی بنیاد رکھی گئی۔ امام مالکؒ (م:۷۹۵ء) حدیث کی تدوین کرنے والوں میں سے اوّلین ہیں اگرچہ ان کی کتاب "**الموطا**" میں تفسیرِ قرآن سے متعلقہ زیادہ روایات موجود نہیں ہیں لیکن حدیث کے دیگر مجموعہ جات میں تفسیرِ قرآن کے حوالے سے کافی مواد موجود ہے جیسا کہ صحیح البخاری میں قرآن کے حوالے سے دو کتابیں موجود ہیں؛ (۱) "کتاب تفسیر القرآن" اور (۲) "کتاب فضائل القرآن"۔ [56] اگرچہ اس نوع کی تفسیر کے حوالے سے صحابہ کرام کی ایک جماعت نے کافی شہرت حاصل کی ہے جیسا کہ حضرت عبد اللہ بن عباسؓ (م:۶۸۷ء) کی طرف منسوب تفسیر "تنویر المقباس من تفسیر ابن عباس" اسی قسم کی ہے، جسے فیروز آبادی (م:۱۴۱۵ء) نے مرتب کر کے شائع کیا۔ [57] اسی طرح بہت سے تابعین نے بھی تفسیر ماثور بیان کی ہے جیسا کہ ضحاک بن مزاحم الھلالیؒ (م: ۷۲۳ء)، عطیہ بن سعد العوفیؒ (م: ۷۲۹ء)، اسماعیل بن عبد الرحمن السدی الکبیرؒ (م: ۷۴۵ء)، محمد بن السائب الکلبیؒ (م: ۷۶۳ء)، محمد بن مروان السدی الصغیرؒ (م: ۸۰۲ء)، مقاتل بن سلیمان الازدی الخراسانیؒ (م:۷۶۷ء)۔ لیکن ان میں سے بہت سے مفسرین جنہوں نے اپنی کتبِ تفاسیر میں اسرائیلی روایات بھی ذکر کی ہیں، پر نقد و جرح بھی ہوئی ہے۔ [58]

اس بات میں کوئی شک نہیں کہ استاد الخولیؒ اور ان کے منہج سے متاثر حضرات نے قرآن کی تفسیر میں احادیث کو بطورِ استدلال پیش کیا ہے، لیکن کئی آیات کی تفسیر میں ان کا طرزِ عمل یہ رہا ہے کہ وہ مفسرین کی طرف سے پیش کی جانے والی روایات کو نہ صرف نظر انداز کرتے ہیں بلکہ انہیں باقاعدہ مسترد کر دیتے ہیں اور اس کی وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ چونکہ یہ روایات ان کے اصول تفسیر سے مطابقت نہیں رکھتیں اس لیے یہ قابلِ قبول نہیں ہیں۔ ضعیف روایات کو قبول نہ کرنا اچنبھے کی بات نہیں، مسئلہ تو اس وقت پیدا ہوتا ہے جب یہ حضرات اس ضمن میں کئی مستند احادیث اور معروف تاریخی روایات کو بھی تسلیم کرنے سے انکار کر دیتے ہیں۔ [59]

(3-1) اسرائیلی روایات کی روشنی میں تفسیر:

اسرائیلی روایات سے مراد قرآنی تفسیر کے ضمن میں بیان کیے جانے والے وہ قصص و واقعات ہیں جو یہود و نصاریٰ کی مذہبی کتابوں اور ان کے علماء کی طرف منسوب کیا جاتے ہیں اور انہیں بسا اوقات یہود و نصاریٰ سے مسلمان ہونے والے اہل علم صحابہ سے نقل کیا جاتا ہے۔ [60] بعض اہل علم کی رائے میں "اگرچہ اسرائیلیات کا اطلاق ایسی روایات پر کیا جاتا ہے جو یہود سے منقول ہوں حالاں کہ اس سے وہ تمام روایات مراد ہیں جو یہود و نصاری دونوں سے منقول ہیں۔ چونکہ ابتدائے اسلام میں مدینہ منورہ میں یہودیوں کا ایک گروہ موجود تھا اور ان کا مسلمانوں کے ساتھ میل جول بھی آسان تھا۔ اسی بنا پر اس لفظ کا اطلاق صرف یہود سے منقول روایات پر ہونے لگا۔" [61] الخولیؒ کا کہنا ہے کہ حدیث میں مَن گھڑت

روایات داخل ہو جانے کی وجہ سے حدیث کو کافی تنقید کا سامنا کرنا پڑا اور چونکہ تفسیر کا حدیث کے ساتھ تعلق ہے، اس لیے تفسیر میں بھی اس طرح کی کافی مَن گھڑت باتیں آ گئیں۔ اور تفسیرِ قرآن میں من گھڑت روایات پائے جانے کا ایک بہت بڑا سبب اسرائیلیات ہیں جن کی سند کی حقیقت کو کسی طرح بھی پرکھا نہیں جا سکتا۔ [62]

(1-4) تفسیر بالرائے:

قرآن مجید کی تفسیرِ نقلی یعنی تفسیر بالماثور کے مقابلہ میں تفسیرِ عقلی شروع ہوئی جسے تفسیر بالرائے [63] کا نام دیا گیا۔ قرآن مجید کی تفسیر کے لیے صرف تفسیر بالماثور منہج ہی درست ہے یا تفسیر بالرائے بھی جائز ہے؟ بعض اہل علم کے بقول اول الذکر ہی صرف صحیح منہج تفسیر ہے جبکہ بعض کی رائے میں تفسیر بالرائے نہ صرف جائز ہے بلکہ ہر وہ شخص جسے عربی زبان و ادب پر مکمل عبور حاصل ہے وہ قرآن مجید کی تفسیر کر سکتا ہے۔ الخولیؒ کے نزدیک مذکورہ بالا دونوں نقطہ ہائے نظر افراط و تفریط پر مبنی ہیں۔ جس نے تفسیر بالرائے کو مطلقاً ناجائز کہہ دیا اس نے بہت سی ایسی نافع چیزوں سے محروم کر دیا جن کی ضرورت تھی اور جس نے ہر صاحبِ علم کو تفسیر کرنے کی اجازت دے دی اس نے اصل تفسیر میں بہت کچھ خلط ملط کرنے کا راستہ کھول دیا۔ [64]

الخولی کہتے ہیں کہ بعض تفاسیر تو اس حد تک باطنی و اشاری رنگ میں رنگی ہوئی ہیں کہ ان سے لوگوں کی توجہ حکمتِ الہیہ اور اصلاحی اغراض سے دور ہو جاتی ہے اور وہ تفسیر کی ان بھول بھلیوں ہی میں کھو کر رہ جاتے ہیں، اس لیے اس طرز کی تفاسیر کو مکروہ طرز کی تفاسیر میں شمار کیا جاتا ہے۔ [65]

(1-5) قرآن مجید کی سائنسی تفسیر:

یہ بات غور طلب ہے کہ استاد الخولیؒ سے پہلے کسی بھی مفسر نے "سائنسی تفسیر" کی کوئی "تعریف" متعین نہیں کی۔ الخولیؒ نے اس کی تعریف یوں کی ہے: "هو التفسير الذي يحكم الإصطلاحات العلمية في عبارة القرآن، ويجتهد في إستخراج مختلف العلوم والآراء الفلسفية منها." (66) یعنی "اس سے مراد ایسی تفسیر ہے جس میں قرآنی عبارات کے ذریعے سائنسی اصطلاحات کو ثابت کیا جاتا ہے۔ نیز قرآنی عبارتوں سے مختلف قسم کے سائنسی علوم اور فلسفیانہ آراء کے استخراج کی کوشش کی جاتی ہے۔"

الخولیؒ کے بعد اس تعریف کو من و عَن انہی الفاظ کے ساتھ شیخ محمد حسین الذہبی نے اپنی کتاب "التفسیر والمفسرون" (67) میں نقل کیا ہے اور انہوں نے کسی مصدر کا ذکر نہیں کیا۔ بظاہر یہی گمان ہوتا ہے کہ انہوں نے یہ تعریف استاد الخولیؒ ہی سے نقل کی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ بعد میں اس تعریف پر کئی اہل علم نے اعتراضات کیے اور اس میں تبدیلی کی گئی۔ [68]

الخولی کا کہنا ہے کہ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ قرآن کی سائنسی تفسیر بہت عرصہ پہلے شروع ہو گئی تھی لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ قرآن مجید کی سائنسی تفسیر کی صحت پر تنقید اور اس کی مخالفت بھی اتنی ہی قدیم ہے جتنی سائنسی تفسیر کی تاریخ۔ جیسا کہ ابو اسحٰق ابراہیم بن موسیٰ الشاطبی (م:۱۳۸۸ء) نے اپنی کتاب "**الموافقات**" میں

قرآن مجید کی ابحاث کے دوران سائنسی تفسیر کی مخالفت کے حوالے سے کلام کیا ہے۔ الخولیؒ نے اپنے ایک مختصر سے رسالے "التفسير: معالم حياته، منهجه اليوم" میں "إنكار التفسير العلمى" کے نام سے ایک بحث کی ہے جس میں تفسیر کی اس نوع کے ردّ میں انہوں نے امام شاطبی کے دلائل واقوال ذکر کیے ہیں۔ امام شاطبی کے اقوال نقل کرنے کے بعد الخولیؒ نے خود بھی تفسیر کی اس نوع کا ردّ کیا ہے اور اس ضمن میں خود سے کئی ایک دلائل بھی ذکر کیے ہیں۔ موصوف نے سائنسی تفسیر کا لغوی، ادبی وبلاغی، دینی واعتقادی ہر پہلو سے ردّ کیا ہے۔ (69)

(6-1) معروف تفسیری اسالیب و مناہج کے بارے میں الخولیؒ کی اصولی رائے:

معروف تفسیری اسالیب و مناہج کے پس منظر میں الخولیؒ کا کہنا ہے کہ ہر شخص اپنی فکری سطح اور اپنی ذہنی استعداد کے مطابق ہی قرآن مجید کی تفسیر کرتا ہے کیونکہ انسان کو نصِ قرآنی سے وہی مفہوم سمجھ آئے گا جس تک اس کو اس کی عقل لے جائے۔ اس لیے ہر تفسیر اپنے مفسر کے شخصی اثر کو ظاہر کرتی ہے چاہے وہ اثری / نقلی تفسیر ہو یا عقلی واجتہادی۔ پھر عقلی و اجتہادی تفسیر کرنے والوں میں بھی ہر مفسر اپنے مزاج اور فہم کے مطابق کسی ایک پہلو پر زیادہ بحث کرتا ہے، مثال کے طور پر ایک مفسر اپنی تفسیر میں کلامی ابحاث کی طرف نکل جاتا ہے تو دوسرا مفسر اپنی تفسیر کو فقہی رنگ دے دیتا ہے، ایک مفسر بلاغت کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے قرآن مجید کی تفسیر کرتا ہے تو دوسرا مفسر قرآن میں مذکور قصوں کو اپنی تفسیر کا موضوع بنالیتا ہے، اسی وجہ سے ہر تفسیر کو کسی خاص صنف کی تفسیر شمار کیا جاتا ہے۔ اگرچہ الخولی نے تفسیر کی ان مذکورہ بالا اقسام پر بالکلیہ کوئی تنقید نہیں کی بلکہ صرف معلومات کی حد تک یہ بات کہی ہے کہ قرآنِ مجید کی طرزِ تفسیر میں مفسر کے لب و لہجہ کا بہت عمل دخل ہوتا ہے۔ ہر مفسر کسی خاص سیاق وسباق میں اور مخصوص اصول وضوابط کا پابند رہتے ہوئے قرآن مجید کی تفسیر کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ (70)

2۔ الخولیؒ کے ہاں منہجِ تفسیر واصولِ تفسیر:

تفسیر قرآن کے ادبی وبیانی اسلوب و منہج کے باب میں استاد امین الخولیؒ نے درج ذیل آراء پیش کی ہیں:

1) ہم مفسرین کے قدیم مناہج کے ساتھ بھی مخلص رہیں گے، ان کے بارے میں حسنِ ظن رکھیں گے، ان کی اچھائیاں تلاش کریں گے اور ان کے محاسن کو واضح کریں گے۔ (71)
2) ہمیں بلاغت کے اصول و مناہج کی جانچ پڑتال کرنا ہوگی اور اس میں سے غلط نظریات کی تردید کرنا ہوگی۔ (72)
3) عربی بلاغت کی معروف تقسیمِ ثلاثہ (علم المعانی، علم البیان اور علم البدیع) کو ختم کیا جائے۔ (73)
4) عربی بلاغت کے دائرہ کار کو وسعت دی جائے، بلاغت کی ابحاث کا ایک ایک جملے پر اقتصار نہ کیا جائے بلکہ بحث کو ادبی فقرات اور قطعات تک توسیع دی جائے۔ (74)
5) الفاظ کے ادبی معانی تلاش کرنے کے لیے کوئی جگہ مخصوص کی جائے۔ (75)

6) بلاغت کی ابحاث میں نحو جیسے علوم کی دوسری ابحاث کو نہ لایا جائے۔[76]

الخولیؒ نے تفسیر قرآن کے ضمن میں عربی بلاغت کی تجدید نو کے حوالے سے جو بات کی ہے، وہ اگرچہ ان سے پہلے بھی کچھ لوگ کر چکے ہیں لیکن استاد امین الخولیؒ نے اس ضمن میں جو منہج اختیار کیا ہے اس جیسا منہج پہلے کسی نے استعمال نہیں کیا۔ آپ نے قدیم اصول وضوابط کو بالکلیہ نظر انداز نہیں کیا اور نہ ہی تمام کے تمام اصولوں میں جدت اختیار کی ہے۔ آپ نے دونوں مناہج میں امتزاج کی راہ نکالنے کی کوشش کی ہے۔[77]

استاد امین الخولی نے قرآن مجید کی تفسیر کا جو طریقہ متعارف کروایا، اس کے مطابق قرآن مجید کی تفسیر کے لیے درج ذیل دو بنیادی اصولوں کو مدِّ نظر رکھنا از حد ضروری ہے:

1) اس بات کو ذہن میں رکھنا چاہیئے کہ قرآن مجید کی ترتیب کا قرآن مجید کی تفسیر پر گہرا اثر پڑتا ہے، اس لیے تفسیرِ قرآن میں تفسیرِ موضوعی کا منہج پیش نظر رکھنا چاہیے۔

2) قرآن مجید کا اس طرح سے مطالعہ کیا جائے کہ یہ عربی زبان کی ایک عظیم کتاب ہے۔ قرآن مجید کی تفسیر کرتے ہوئے زبان وادب کو ہر چیز پر فوقیت دینی چاہیے اور اس کے لیے بیانی منہج کو ملحوظِ خاطر رکھنا چاہیے۔

مذکورہ بالا دونوں اصولوں کی مزید وضاحت ذیل میں مذکور ہے۔

1۔ ترتیبِ قرآن اور تفسیرِ موضوعی کی اصولی حیثیت:

متقدم مفسرین نے قرآن مجید کی تفسیر آیت با آیت اور جز با جز یعنی بعینہٖ قرآن کی موجودہ ترتیب کے موافق کی ہے اور قرآن مجید کی تفسیر کا یہ طریق کار کئی صدیاں ایسے ہی چلتا رہا۔ جبکہ بعد میں آنے والے مفسرین کے ایک گروہ نے اس ضمن میں ایک نئی بحث کا آغاز کیا کہ آیا قرآن مجید کا موضوعاتی لحاظ سے مطالعہ کیا جا سکتا ہے؟ ان مفسرین نے اپنا یہ موقف پیش کیا کہ قرآن مجید موضوعاتی کتب کی ترتیب پر نہیں ہے کیونکہ نہ تو اس میں مقدمہ ہے نہ ہی موضوعاتی ابحاث کی طرح فصلیں اور ابواب۔ قرآن مجید میں چند ایک سورتیں ہیں، ہر سورت میں کچھ آیات ہیں اور ہر آیت کا کوئی نہ کوئی مقصد ہے، کچھ آیات زجر و توبیخ کے لیے ہیں تو کچھ آیات میں واقعات بیان ہوئے ہیں، کچھ آیات میں اسلامی احکامات بیان ہوئے ہیں تو کچھ آیات جنت و جہنم کا نقشہ کھینچتی ہیں۔[78]

محسوس یہ ہوتا ہے کہ علماء کے اس گروہ نے اہلِ استشراق سے متاثر ہو کر یہ بات کی ہے کیونکہ مستشرقین نے بھی قرآن کریم پر کچھ ایسا ہی اشکال کیا ہے۔ ان کا یہ گمان ہے کہ قرآن مجید خلط ملط ہے اور اسے وحدتِ موضوع کا خیال کیے بنا، بغیر کسی ترتیب کے اکٹھا کر دیا گیا ہے۔ ہر ایک سورت میں کئی کئی موضوعات داخل کر دیئے گئے ہیں اور ان کے محتویات میں مناسبت کا خیال بھی نہیں رکھا گیا۔ ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی شخص تین مختلف الفاظ اکٹھے کہہ دے اور ان تینوں الفاظ میں کوئی مناسبت ہی نہ ہو جیسا کہ شہد، شراب، دودھ۔[79] استاد الخولیؒ کا نقطہ نظر بھی یہی ہے کہ قرآن مجید میں مختلف موضوعات کو ایک ہی جگہ جمع کر دیا جاتا ہے جس کی وجہ سے قرآن مجید کی موجودہ ترتیب کا اعتبار کرتے ہوئے قرآنی آیات

کی صحیح تفسیر پیش کرنا مشکل امر ہے۔ اس اشکال کا حل بھی استاد امین الخولیؒ نے خود ہی دیا ہے کہ قرآن مجید کی موضوعاتی اعتبار سے تفسیر کرنے سے یہ مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔ الخولیؒ ان اوّلین شخصیات میں سے تھے جنہوں نے قرآن مجید کی موضوعاتی تفسیر کے جدید طریقِ کار کو متعارف کرایا اور اس حوالے سے مصری یونیورسٹی میں سب سے پہلے آواز اٹھائی۔ آپ نے اس رائے کو درست قرار دیا کہ قرآن مجید کی موضوعاتی اعتبار سے تفسیر کی جائے۔ آپ نے قرآن مجید کی پاروں اور اجزاء کی ترتیب کے اعتبار سے تفسیر کرنے کے عمل کی حوصلہ شکنی کی۔[80]

آپ کے بقول قرآن کے بارے میں یہ بات معروف ہے کہ اس کی موضوعات اور مسائل کے اعتبار سے اس طرح ترتیب نہیں دی گئی کہ اس کے علیحدہ علیحدہ ابواب اور فصول ہوں اور اس میں کسی ایک موضوع سے متعلقہ تمام آیات ایک ہی جگہ اکھٹی کر دی گئی ہوں اور نہ ہی اس کی ترتیب عقائد کی کتابوں کی طرح ہے حالاں کہ اس میں عقیدے کے اصول بیان کیے گیے ہیں۔ اسی طرح اس کی ترتیب شرعی قوانین کی کتابوں کی طرح بھی نہیں ہے، حالاں کہ اس میں شرعی قوانین کے اصول بھی موجود ہیں؛۔ اسی طرح قرآن مجید کی ترتیب اخلاقیات، تاریخ اور قصص وغیرہ کی کتابوں کی طرح بھی نہیں ہے بلکہ یہ کہنا بھی بے جانہ ہو گا کہ قرآن مجید کی ترتیب بعض دیگر دینی کتابوں کی طرح بھی نہیں ہے جن میں حادثاتِ زندگی کو مختلف اسفار کی صورت میں بیان کیا گیا ہے اور ہر حادثے کو کسی نہ کسی سفر کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ قرآن مجید کی ترتیب نزولِ آیات کی ترتیب کے لحاظ سے بھی نہیں ہے، بلکہ قرآن مجید کا اندازِ بیان ان سب سے مختلف رہا ہے۔ قرآن مجید میں بہت سے موضوعات کو بیان کیا گیا ہے کسی ایک موضوع کو شروع سے لے کر آخر تک کسی ایک ہی جگہ پر یکجا نہیں کیا گیا۔ اسی طرح قاری یہ مشاہدہ بھی کرتا ہے کہ ایک ہی سورت میں کئی ایک فنون موجود ہیں اور مختلف مقاصد کو مدِّ نظر رکھا گیا ہے۔ جبکہ دوسری طرف کسی ایک فکر و نظریہ کی وضاحت مختلف مقامات اور متعدد سورتوں میں مختلف انداز سے اس طرح کی گئی ہے کہ ان تمام مقامات کو جمع کر کے وہ فکر و نظریہ مکمل و جامع مفہوم دیتا ہے۔

اس لیے ایک موضوع سے متعلقہ تمام قرآنی نصوص کو ایک ہی جگہ جمع کر کے اس موضوع کا صحیح فہم حاصل کیا جاسکتا ہے۔ جیسا کہ دیگر دینی کتب میں ایک ہی موضوع سے متعلق تمام آیات ایک ہی جگہ اکھٹی ہوتی ہیں اور ان دینی کتب کی تفسیر کرنے والے مفسرین کو ان آیات کے فہم میں کوئی دشواری نہیں ہوتی۔ قرآن مجید کی ترتیب میں وحدتِ موضوع کا مطلق طور پر لحاظ نہیں رکھا گیا، بعینہ آیات کی ترتیب میں ترتیبِ زمنی کا بھی لحاظ نہیں رکھا گیا۔ ایک ہی موضوع سے متعلقہ آیات کو مختلف مقامات پر اور مختلف سیاق و حالات کے تحت بیان کیا گیا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ قرآن مجید کی تفسیر کرتے ہوئے موضوعاتی اعتبار کو ملحوظِ خاطر رکھا جائے۔ اس کا طریقہ کار یہ ہو گا کہ ایک موضوع سے متعلقہ آیات کو اکھٹا کیا جائے گا، ان کو زمانی اعتبار سے ترتیب دیا جائے گا، اس کے بعد ان آیات کی تفسیر و تشریح کی جائے گی، اس طرح ان آیات کا صحیح معنی و مفہوم واضح ہو گا۔ لہذا مناسب یہی معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید کی سورتوں کی ترتیب کے اعتبار سے تفسیر کرنے کی بجائے اس کی موضوعاتی اعتبار سے تفسیر کی جائے۔[81]

2۔ تفسیرِ قرآن میں عربی زبان وادب کی اصولی حیثیت:

استاد الخولیؒ کے نزدیک قرآن مجید کی تفسیر: "اس غرض اور اس مقصدِ اول کے تحت کی جانی چاہیے کہ یہ عربی (زبان وادب) کی کتابِ اکبر ہے جس کا ادبی اثر بہت بڑا ہے۔ یہ وہی کتاب ہے جس نے عربی زبان کو دوام بخشا اور اس کی حفاظت کی، یہ کتاب عربی زبان کا فخر اور اس کی میراث بنی، یہی قرآن مجید کی وہ صفت ہے جسے ہر عربی النسل جانتا ہے چاہے وہ کسی بھی مذہب سے تعلق رکھتا ہو... قرآن مجید کا مطالعہ کرنے والے ہر شخص کے لیے واجب ہے کہ وہ اس کتاب کی تفسیر کرتے ہوئے اس کا صحیح معنوں میں حق ادا کرے۔ اگرچہ اس کا مقصد اس کتاب سے ہدایت لینا یا کسی قسم کا نفع اٹھانا نہ بھی ہو لیکن پھر بھی مطالعہ کرنے والے کے لیے ضروری ہے کہ وہ سب سے پہلے عربی لغت کا خیال کرتے ہوئے اس کتاب کا مطالعہ کرے، چاہے مطالعہ کرنے والا کسی بھی عقیدے کا حامل کیوں نہ ہو۔ در اصل قرآن مجید عربی فن کی ایک مقدس کتاب ہے۔ قرآن مجید کے اغراض ومقاصد اور اس کے معانی ومفاہیم کو سمجھنے کے لیے عربی زبان کا جاننا از حد ضروری ہے"۔[82] الخولیؒ نے اپنے منہج تفسیر کے سلسلہ میں جو قرآنی اصول پیش کیے ان میں سے ایک اصول یہ بھی ہے کہ عصرِ حاضر میں تفسیر کا سب سے پہلا مقصد صرف ادبی تفسیر کرنا ہے اور اسی پر بقیہ چیزوں کو موقوف کیا جائے گا اور یہی عصرِ حاضر کا تقاضا ہے۔ یعنی وہ قرآنِ مجید کے ادبی پہلو کو بقیہ تمام مقاصد پر مقدّم کرنا چاہتے تھے۔

قرآن مجید کی جدید طریقے سے تفسیرِ ادبی کے حوالے سے استاد الخولیؒ نے جو نئی جہت متعارف کرائی، اس بنیاد پر تفسیر ادبی کی دو اقسام ہیں: (الف) قرآن کے بارے میں مطالعہ (ب) قرآن میں مطالعہ۔

پہلی صورت یعنی "قرآن مجید کے بارے میں مطالعہ" کا مطلب یہ ہے کہ قرآن مجید کے متعلقات کا علم حاصل کیا جائے۔ ہر ایسی چیز کو احاطہ علم میں لانے کی کوشش کی جائے جس کا تعلق کسی نہ کسی حوالے سے قرآن مجید کے ساتھ ہو۔ استاد امین الخولیؒ نے اس کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے، ان کا کہنا ہے کہ قرآن مجید کو سمجھنے کے لیے قرآن مجید کے بارے میں عمومی وخصوصی مطالعہ کیا جاتا ہے۔ قرآن مجید کی معرفت کے لیے قرآن مجید کا خصوصی مطالعہ کرنا از حد ضروری ہے، چھٹی صدی ہجری سے اس مطالعہ کو اصطلاحی لحاظ سے علوم القرآن کے نام سے جانا جاتا ہے جس میں نزولِ قرآن، جمع قرآن، کتابتِ قرآن اور قراءتِ قرآن جیسی ابحاث آتی ہیں۔ اکثر مفسرینِ قرآن اپنی تفاسیر کے مقدمہ میں ان تمام ابحاث کا یا ان میں سے کسی نہ کسی ایک کا تذکرہ ضرور کرتے تھے۔[83]

جہاں تک قرآن مجید کے بارے میں عمومی مطالعہ کا تعلق ہے تو اس سے مراد ایسا ماحول ہے جس میں قرآن مجید کا نزول ہوا اور جس ماحول میں قرآن مجید جمع کیا گیا، لکھا گیا، پڑھا گیا اور حفظ کیا گیا۔ اہلِ عرب وہ پہلے لوگ تھے جن سے خطاب ہوا اور انہیں اللہ تعالیٰ کا پیغام پڑھ کر سنایا گیا تاکہ وہ اس پر عمل پیرا ہو کر ترقی کی منازل طے کر سکیں اور اسے دنیا کی تمام اقوام تک پہنچا سکیں۔ قرآن مجید خالصتاً عربی زبان میں نازل کیا گیا، اس کا مزاج اور اسلوب عربی ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿قُرْآنًا عَرَبِيًّا غَيْرَ ذِي عِوَجٍ﴾[84] "یہ قرآن عربی زبان میں نازل کیا گیا ہے جس میں کوئی کجی نہیں۔" اس لیے

ضروری ہے کہ قرآن مجید کو سمجھنے کے لیے اس عربی ماحول کی مکمل معرفت حاصل کی جائے۔ اگر کوئی شخص عربی ادب کا مطالعہ کرنا چاہتا ہے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ اہلِ عرب اور ان کے ماحول کو خوب اچھی طرح گہرائی سے سمجھے۔ استاد الخولیؒ کا کہنا ہے کہ یہ قرآن اس عربی ادب کا پیش خیمہ ہے جب کہ ہم قرآن مجید کا اس لحاظ سے محدود مطالعہ کرتے ہیں، یہاں تک کہ ہمارے اپنے عرب ممالک میں اس حوالے سے کافی جمود دیکھنے کو ملتا ہے۔ لہذا ہمیں ہر گز یہ کہنے کا حق نہیں پہنچتا کہ ہم قرآن مجید کے ادبی فہم کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے قرآن مجید کی تفاسیر کرتے ہیں۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ ہم اپنی تفاسیر میں حجر، احقاف، ایکہ، مدین اور عاد و ثمود کے مقامات کا تذکرہ تو کرتے ہیں لیکن ہمیں ان مقامات کے حوالے سے بالکل بھی معلومات نہیں ہیں۔ لہذا ہمارے لیے یہ کہنا مناسب نہیں ہو گا کہ ہم نے ان مقامات کے حوالے سے موجود قرآنی آیات کے مکمل مفہوم کو سمجھ لیا ہے یا اس کے صحیح مفہوم کا ہمیں ادراک ہو گیا ہے۔ (85)

دوسری صورت یعنی "خود قرآن کا مطالعہ" کا مفہوم یہ ہے کہ قرآن مجید کے مفردات کا مطالعہ کیا جائے اور قرآن مجید کی ادبی تفسیر کے لیے ضروری ہے کہ مفرداتِ قرآن کو اس مفہوم میں جا کر سمجھا جائے جو مفہوم نبی اکرم ﷺ نے مراد لیا ہو۔ جب قرآن مجید کے مفرد الفاظ کے معانی کا ادراک ہو جائے تب قرآن مجید میں ان الفاظ کے مستعمل معانی کو اکٹھا کیا جائے، اس طریقے سے قرآنی الفاظ کے صحیح معانی و تفاسیر تک پہنچا جا سکتا ہے۔ الخولیؒ کے بقول مفردات کی بحث کے بعد ادبی مفسر مرکب الفاظ کی تفسیر کرے گا، اور اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ اس ضمن میں نحو و بلاغت جیسے ادبی علوم سے مدد لے گا۔ یہ نحوی علوم تفسیرِ قرآن میں مختلف معانی کے بیان، ان کی تحدید اور ایک ہی آیت کی مختلف قراءات کے متفقہ معانی پر غور و فکر کرنے میں استعمال ہوتے ہیں، بالفاظِ دیگر یہ نحوی علوم تفسیر کی اصل مقصود نہیں ہیں بلکہ یہ صرف اور صرف قرآن مجید کے حسن کو مثالی بنانے کے لیے استعمال ہوئے ہیں۔

الخولیؒ کے اصول تفسیر کے نتائج و اثرات:

امین الخولی نے چونکہ تفسیرِ قرآن کی ایک نئی جہت متعارف کرائی تھی جس میں بہت سی جگہ متقدم مفسرین سے واضح اختلاف بھی پایا جاتا ہے، اس لیے ان پر کئی اعتراضات کی بوچھاڑ ہوئی، یہاں تک کہ ان کو ان کے عہدہ سے معزول ہونے پر بھی مجبور کر دیا گیا۔ آپ کی جو تفسیری تاویلات آپ کے اصول تفسیر کی روشنی میں محل نزاع بنیں، ان میں سے ایک اہم بحث ذیل میں ذکر کی جا رہی ہے۔

﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنْزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ هُدًى لِلنَّاسِ وَبَيِّنَاتٍ مِنَ الْهُدَى وَالْفُرْقَانِ﴾ (86)

"رمضان کا مہینہ وہ (مہینہ) ہے جس میں قرآن مجید نازل کیا گیا جس میں انسانوں کے لیے ہدایت ہے اور اس میں ہدایت کی اور (حق کو باطل سے) جدا کرنے کی روشن نشانیاں ہیں۔"

مذکورہ بالا آیتِ قرآنی کے ضمن میں الخولیؒ لکھتے ہیں کہ شروع سے اب تک مفسرین نے اس آیت کی جو تفسیر کی ہے اس پر سوال یہ ہے کہ جب یہ بات مسلّم ہے کہ قرآن مجید کا نزول تقریباً تئیس (۲۳) سال کے عرصہ میں مکمل ہوا تو پھر

مذکورہ آیت کی روشنی میں قرآن مجید کا نزول رمضان کے مہینہ میں کیسے ہوا؟ الخولیؒ فرماتے ہیں کہ مفسرین نے اس کی مختلف توجیہات بیان کی ہیں۔ موصوف نے ان توجیہات کو ذکر کرنے کے بعد ان کا ردّ بھی کیا ہے، مثلاً الخولیؒ فرماتے ہیں کہ

1) ہمارے مفسرین کبھی یہ جواب دیتے ہیں کہ اس آیت سے مراد یہ ہے کہ قرآنِ مجید کا نزول مکمل طور پر پہلی مرتبہ لوحِ محفوظ سے آسمانِ دنیا پر ہوا اور اسے بیت العزت میں رکھ دیا گیا اور یہ واقعہ رمضان کے مہینہ میں پیش آیا۔ اسی لیے مذکورہ آیت میں یہ بات کہی گئی ہے کہ رمضان کے مہینہ میں قرآنِ مجید کا نزول ہوا۔ الخولیؒ مفسرین کے اس جواب کا ردّ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اگر قرآن مجید کے نزول کو کسی طرح رمضان کے مہینہ میں ثابت نہ کیا گیا اور مذکورہ بالا آیت سے صرف یہ ثابت کیا جائے کہ اس سے مراد قرآن کا ایک آسمان سے دوسرے آسمان تک نازل کیا جانا مراد ہے تو یہ لوگوں کے لیے رہنما کہلانے اور ہدایت و فرقان کی واضح نشانی کہلانے کے لائق نہ ہو گا۔ کیونکہ مذکورہ بالا آیت میں یہ شرط ہے کہ ایسا قرآن ہدایت و رہنمائی کا ذریعہ بنے گا جس کا نزول رمضان کے مہینہ میں ہوا ہو گا۔ (87)

2) کبھی مفسرین یہ جواب دیتے ہیں کہ قرآن مجید کا نزول تمام مہینوں میں ہوتا رہا لیکن مذکورہ بالا آیت کا مطلب یہ ہے کہ حضرت جبرائیلؑ نبی مکرم ﷺ کے ساتھ قرآن مجید کی سنائی و دہرائی کا عمل رمضان کے مہینہ میں کرتے تھے۔ الخولیؒ نے مفسرین کے اس جواب کا بھی ردّ کیا ہے، آپ لکھتے ہیں کہ کیا اس دہرائی وسنائی سے مراد نزولِ قرآن ہے یا یہ دہرائی قرآن مجید کے نزول کے بعد ہوتی تھی؟ کیا لفظِ نزول کی تفسیر کے لیے دہرائی اور سنائی جیسے الفاظ استعمال کرنا ٹھیک ہے؟ میرے خیال میں تو ایسا کرنا ٹھیک نہیں ہے۔

3) کبھی یہ مفسرین اس کا یوں جواب دیتے ہیں کہ اس سے مراد رمضان کے مہینہ میں روزوں سے متعلقہ آیات کا نزول ہے۔ حالانکہ ان کی یہ توجیہ بھی ٹھیک نہیں ہے کیونکہ یہ کوئی ایسی چیز نہیں جس کی وجہ سے رمضان کو امتیاز ہو۔

4) کبھی یہ مفسرین نزول سے مراد ابتداءِ نزول لیتے ہیں کہ قرآن مجید نازل ہونے کی ابتدا رمضان کے مہینہ سے ہوئی۔ حالانکہ یہ توجیہ بھی ٹھیک نہیں ہے کیونکہ اس طرح کی جو روایات بیان کی جاتی ہیں ان روایات میں ضعف ہے اور ابتداءِ نزول کی کسی بھی حتمی تاریخ کا کسی کو علم نہیں، اگر کسی کو معلوم ہے تو وہ بتادے! (88)

مفسرین کی مذکورہ بالا توجیہات کے بعد الخولیؒ فرماتے ہیں کہ ان میں سے کوئی بھی توجیہ ایسی نہیں جس پر آیتِ مذکورہ کی تشریح کے حوالے سے اطمینان ہو سکے۔ اس سب کے بعد موصوف رمضان کے مہینہ میں نزولِ قرآن کے حوالے سے اپنی رائے بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں: مفسرین نے لفظ "نزول" سے کسی چیز کے مادی طور پر ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونے، گرنے یا نیچے اترنے کے معنی مراد لیے ہیں۔ حالانکہ اس کے صرف یہ معانی نہیں ہیں اور نہ ہی قرآن مجید نے اس لفظ کو کسی چیز کے صرف مادی طور پر ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونے تک محدود کیا ہے بلکہ قرآن

مجید نے اس لفظ کو حسی معانی کے طور پر بھی استعمال کیا ہے جس میں کسی چیز کے مادی طور پر ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونے کا معنیٰ نہیں ہوتا۔ پھر الخولیؒ نے اس بات کو ثابت کرنے کے لیے درج ذیل قرآنی آیات کو بطورِ دلیل ذکر کیا ہے:

1) ﴿ أَنْزَلْنَا الْحَدِيدَ فِيهِ بَأْسٌ شَدِيد ﴾ (89) ("ہم نے لوہا اتارا جس میں بہت زور ہے")... اب اس آیت میں لفظ "نزول" سے ہر گز یہ مراد نہیں ہے کہ لوہے کو آسمان سے نازل کیا گیا۔

2) ﴿ يَا بَنِي آدَمَ قَدْ أَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُوَارِي سَوْآتِكُمْ وَرِيشًا ﴾ (90) ("اے اولادِ آدم! یقیناً ہم نے تم پر لباس اُتارا ہے تاکہ وہ تمہارے جسم کے قابلِ شرم حصے چھپائے اور یہ (تمہارے جسم کے لیے) حفاظت اور زینت کا ذریعہ ہے")۔ اس آیت میں بھی لفظ "نزول" سے مراد یہ نہیں ہے کہ یہ لباس آسمان سے دنیا میں نازل کیا گیا۔

یہ دلائل دینے کے بعد استاد الخولیؒ فرماتے ہیں کہ جہاں نزول سے مراد کسی چیز کا ایک جگہ سے کسی دوسری جگہ مادی طور پر منتقل ہونا مقصود ہوتا ہے وہاں اللہ تعالیٰ کی طرف سے قرآن مجید میں اس چیز کی خود ہی وضاحت کر دی جاتی ہے اور اس کے نزول کی جگہ کا بھی ذکر کر دیا جاتا ہے جیسا کہ درج ذیل آیاتِ قرآنیہ اس بات کی شاہد ہیں:

1) ﴿أَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاء ﴾ (91) (آسمان سے پانی نازل کیا گیا)

2) ﴿وَأَنْزَلْنَا مِنَ الْمُعْصِرَاتِ مَاءً ثَجَّاجًا﴾ (92) (اور ہم نے نچڑنے والی بدلیوں سے موسلا دھار مینہ نازل کیا)

3) ﴿أَنْزِلْ عَلَيْنَا مَائِدَةً مِنَ السَّمَاء﴾ (93) (ہم پر آسمان سے دستر خوان نازل فرما)

الخولیؒ فرماتے ہیں کہ مذکورہ بالا آیات میں لفظ "نزول" کو کسی چیز کے ایک جگہ سے دوسری جگہ پر مادی طور پر منتقل ہونے کے معنیٰ میں استعمال کیا جائے گا کیونکہ ان آیات میں ان چیزوں کے نزول کی جگہ خود قرآن مجید نے صراحت سے بیان فرما دی ہے لہٰذا ان آیات میں نزول حسی نہیں ہو سکتا جب کہ رمضان اور اس میں قرآن مجید کے نزول والی آیت میں کسی مبدا (نزول کی جگہ) کا ذکر نہیں کیا گیا، لہٰذا ان آیات میں لفظ "نزول" کو حسی معانی ہی میں لیا جائے گا اور اس کا معنیٰ ہوگا کہ کسی چیز کا قرب اختیار کرنا یا اس سے ہدایت حاصل کرنا۔ شروع میں بیان کی گئی آیت میں لفظ "نزول" کا یہ معنیٰ کیا جائے گا کہ رمضان کے مہینہ میں قرآن مجید کے نزول سے مراد یہ ہے کہ اس مہینہ میں قرآن کا قرب حاصل کر لیا جائے اور اس سے مانوس ہوا جائے تاکہ اس کی ہدایت اور نشانیاں واضح ہو جائیں۔ (94)

خلاصہ ونتائج:

امین الخولیؒ نے اپنی پوری زندگی قرآن مجید میں غور و فکر کرنے اور اس کی تفسیر کے اصول و منہج متعین کرنے میں گزاری۔ منہج تفسیر کے سلسلہ میں آپ نے جو اصول متعارف کرائے وہ بنیادی طور پر دو طرح کے اصول ہیں۔ ایک یہ کہ قرآن مجید کی تفسیر میں تفسیرِ موضوعی کا منہج پیشِ نظر رکھا جائے۔ دوسرا یہ کہ قرآن مجید کو عربی زبان و ادب کی ایک عظیم کتاب سمجھتے ہوئے اس کا مطالعہ کیا جائے اور اس کی تفسیر میں زبان و ادب کو ہر دوسری چیز پر فوقیت دی جائے۔ آپ کے

نزدیک تفسیری ادب میں کبھی تفسیر موضوعی کو روایتی مفسرین نے صحیح معنوں میں اختیار نہیں کیا۔ اسی طرح متقدم مفسرین نے بلاغت کے دائرہ کار کو بھی ہمیشہ بہت محدود رکھا۔ الخولیؒ تفسیر قرآن میں ایک طرف تفسیر موضوعی کو اور دوسری طرف عربی زبان و ادب اور بلاغت کے دائرہ کار کو وسعت دینا چاہتے تھے۔ ان کے بقول عربی بلاغت کا گہرا علم ہی صحیح اور حقیقی تفسیر تک پہنچا سکتا ہے۔ اپنے اصولوں کی روشنی میں الخولیؒ کا منہج تفسیر یہ نمایاں ہوتا ہے کہ وہ جب کسی لفظ کے معنی و مفہوم کا تعین کرنا چاہتے ہیں تو ان تمام قرآنی آیات کو ایک جگہ جمع کرتے ہیں جن میں مطلوبہ لفظ مذکور ہے۔ پھر وہ ہر آیت میں عربی زبان و ادب کے قواعد کی روشنی میں یہ تحقیق کرتے ہیں کہ یہاں اس مطلوبہ لفظ کا کیا مفہوم مراد لیا گیا ہے؟ اور اس کی کیا وجہ ہے؟ پھر وہ زیر بحث الفاظ کے کسی ایک معنی و مفہوم کا تعین کرتے ہوئے اس کے دیگر معانی کا انکار اور تغلیط کرتے ہیں۔ الخولیؒ قرآنی آیات کی اپنے اصولوں کے مطابق تفسیر کرتے ہوئے اس بات کی بھی پروا نہیں کرتے کہ آپ کا مؤقف تمام سلف مفسرین کے موقف کے بالکل خلاف جا رہا ہے۔ روایتی مفسرین سے مخالفت کی وجہ سے روایتی علمی حلقوں کی طرف سے آپ پر کافی نقد و جرح کی گئی، لیکن دوسری طرف آپ نے اپنے پیچھے عائشہ بنت الشاطیؒ جیسے کچھ ہونہار شاگرد چھوڑے جنہوں نے آپ کے تفسیری منہج و اصول کی پیروی کرتے ہوئے تفسیری ادب میں مزید علمی اضافے کیے اور علمی حلقوں میں اپنی حیثیت کو مزید مضبوط بنانے کی کوششیں جاری رکھیں۔

حواشی و حوالہ جات

1۔ الزرقانی، محمد عبد العظیم، مناهل العرفان في علوم القرآن، بیروت، دار الکتب العربي، ۱۹۹۵ء، ج ۲، ص ۷

2۔ البقرۃ ۲:24-23

3۔ اس موضوع پر لکھی گئی کتابوں میں ابو عبیدہ معمر بن المثنیؒ (م: ۸۲۴ء) کی "مجاز القرآن"، امام فراءؒ (م: ۸۲۲ء) کی "معانی القرآن" اور امام جاحظؒ (م: ۸۶۸ء) کی "نظم القرآن" وغیرہ شامل ہیں۔ اسی طرح قرآن مجید کے لغوی اعجاز سے تعرض کرنے والی کتابوں / تفسیروں میں امام زمخشریؒ (م: ۱۱۴۳ء) کی "الکشاف"، امام بقاعیؒ (م: ۱۴۸۰ء) کی "نظم الدرر فی تناسب الآیات والسور"، علامہ آلوسیؒ (م: ۱۸۵۴ء) کی "روح المعانی" اور امام السیوطیؒ (م: ۱۵۰۵ء) کی "تناسق الدرر فی تناسب السور" وغیرہ بھی معروف ہیں۔

4۔ ابو عبیدہ، مجاز القرآن، مصر، مکتبۃ الخانجی بالقاهرة، 1962ء۔ اس کتاب پر ڈاکٹر محمد فواد سیزگن نے تعلیق لکھی ہے۔ یہ تفسیر دو جلدوں میں ہے اور مکتبہ شاملہ میں موجود ہے۔

5. The Encyclopedia of Islam, Hamilton Alexander Rosskeen Gibb (Ed), (Leiden: Brill, 1994), 1:158

6۔ احمد امین، ضحی الاسلام، قاہرہ، لجنۃ التالیف والترجمۃ والنشر، ۱۹۵۲ء، ج ۲، ص146

7۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیں: حامد محمد امین شعبان، امین الخولی والبحث اللغوی، قاہرہ، مکتبۃ الانجلو المصریۃ، ۱۹۸۰ء، ص ۷

8۔ ایضاً، ص ۹

9۔ مدارس میں بچوں کو جمعہ کے دن حفظ کی چھٹی ہوا کرتی تھی لیکن امین الخولی کو اس دن بھی قرآن مجید حفظ کرنا ہوتا تھا۔
10۔ کامل سعفان، ڈاکٹر، امین الخولی شیخ الامناء، قاہرہ: الدار المصریۃ اللبنانیۃ، ۱۹۹۸ء، ص ۱۰
11۔ ایضاً، ص ۱۱-۱۲
12۔ ایضاً، ص ۱۲-۱۳
13۔ ایضاً، ص ۱۳
14۔ ایضاً، ص ۹
15۔ محمد مہدی علام، مجمع اللغۃ العربیۃ فی ثلاثین عاما: المجمعیون، قاہرہ، الھیئۃ العامۃ لشؤون المطابع الامیریۃ، ۱۹۶۶ء، ص ۴۸
16۔ اسماعیل، عبداللہ احمد خلیل، إحیاء النحو وتجدیدہ بین إبراھیم مصطفی وأمین الخولي، لیبیا، جامعۃ عمر المختار، ۱۹۹۴ء، ص ۹۷
17۔ محمد مہدی علام، مجمع اللغۃ العربیۃ، ص ۴۸
18۔ عبداللہ احمد خلیل، إحیاء النحو وتجدیدہ، ص ۹۷
19۔ محمد مہدی علام، مجمع اللغۃ العربیۃ، ص ۴۸
20۔ امین الخولی، فن القول، قاہرہ، مطبعۃ دار الکتب المصریۃ، ۱۹۹۶ء، ص ۲۱
21۔ ایضاً، ص ۲۲
22۔ ایضاً، ص ۲۳
23۔ محمد مہدی علام، مجمع اللغۃ العربیۃ، ص ۴۸؛ حامد محمد امین شعبان، امین الخولی والبحث اللغوی، ص ۱۵
24۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیں: محمد مہدی علام، مجمع اللغۃ العربیۃ، ص ۴۸
25۔ امین الخولی، فن القول، ص ۲۳
26۔ ایضاً
27۔ محمد مہدی علام، مجمع اللغۃ العربیۃ، ص ۴۸
28۔ ایضاً، ص ۲۳۹
29۔ عبداللہ احمد خلیل، إحیاء النحو وتجدیدہ، ص ۲۸
30۔ حامد محمد امین شعبان، امین الخولی والبحث اللغوی، ص ۱۵
31۔ کامل سعفان، امین الخولی شیخ الامناء، ص ۱۷-۱۸
32۔ ایضاً، ص ۲۵
33۔ ایضاً، ص ۲۸
34۔ ایضاً، ص ۳۵
35۔ ایضاً، ص ۳۷
36۔ محمد مہدی علام، مجمع اللغۃ العربیۃ، ص ۴۹
37۔ ایضاً، ص ۴۸
38۔ عبداللہ احمد خلیل، إحیاء النحو وتجدیدہ، ۹۹
39۔ کامل سعفان، أمین الخولي في مناھج تجدیدہ، قاہرہ، المجلس الأعلی لرعایۃ الفنون والآداب والعلوم الإجتماعیۃ، ۱۹۷۷ء)، ص ۱۵۳
40۔ محمد مہدی علام، مجمع اللغۃ العربیۃ، ص ۴۸

41۔ کامل سعفان، امین الخولی شیخ الامناء، ص ۹۱-۹۳
42۔ محمد مہدی علام، مجمع اللغۃ العربیۃ، ص ۴۸
43۔ کامل سعفان، امین الخولی شیخ الامناء، ص ۸۸
44۔ ایضاً
45۔ محمد مہدی علام، مجمع اللغۃ العربیۃ، ص ۴۹
46۔ حامد محمد امین شعبان، امین الخولی والبحث اللغوی، ص ۱۸؛ کامل سعفان، امین الخولی شیخ الامناء، ص ۹۳
47۔ امین الخولی، فن القول، ص ۲۳
48۔ موجز دائرۃ المعارف الإسلامیۃ، مادۃ تفسیر، شارجہ: مرکز الشارقۃ للإبداع الفکري، 1998ء، ج ۸، ص ۲۳۱۱
49۔ امین الخولی، دراسات اسلامیۃ، قاہرہ، مطبعۃ دار الکتب المصریۃ، 1996ء، ص ۱۷
50۔ موجز دائرۃ المعارف الإسلامیۃ، مادۃ تفسیر، ج ۸، ص ۲۳۱۱
51۔ ایضاً
52۔ ابن قتیبہ، عبد اللہ بن مسلم الدینوری، المسائل والاجوبۃ، دمشق: دار ابن کثیر، 1990ء، ص ۸
53۔ دیکھیے: الصابونی، الشیخ محمد علی، التبیان في علوم القرآن، کراچی، مکتبۃ البشری للطباعۃ والنشر، ۲۰۱۱ء، ص 92؛ الزرقانی، محمد عبد العظیم، مناھل العرفان في علوم القرآن، ج ۲، ص ۱۲
54۔ تفسیر بالماثور کے لیے علماء مفسرین نے مختلف نام ذکر کیے ہیں جیسا کہ تفسیر توقیفی، اثری تفسیر، روایتی تفسیر یا نقلی تفسیر۔
55۔ امین الخولی، دراسات اسلامیۃ، ص ۲۰
56۔ موجز دائرۃ المعارف الإسلامیۃ، مادۃ تفسیر، ج ۸، ص ۲۳۱۲
57۔ امین الخولی، دراسات اسلامیۃ، ص ۲۰-۲۱
58۔ موجز دائرۃ المعارف الإسلامیۃ، مادۃ تفسیر، ج ۸، ص ۲۳۱۳-۲۳۱۵
59۔ بطور مثال دیکھیے: بنت الشاطئ، التفسیر البیاني، ج ۲، ص 67-69۔ اس پر ہمارا ایک اور مستقل مضمون بھی زیر تکمیل ہے۔
60۔ موسی ابراہیم لابراہیم، بحوث منھجیۃ في علوم القرآن، عمان، دار عمار للنشر والتوزیع، ۱۹۹۶ء، ص ۹۹
61۔ فہد الرومی، بحوث فی أصول التفسیر ومناھجہ، ریاض، مکتبۃ التوبۃ للنشر والتوزیع، ۱۹۹۸ء، ص ۸۸
62۔ امین الخولی، دراسات اسلامیۃ، ص ۲۲-24
63۔ تفسیر بالرائے کی مزید تفصیل کے لیے دیکھیں: امام راغب الاصفہانی، ابو القاسم حسین بن محمد، مقدمۃ التفسیر للراغب الاصفھاني، جامعہ طنطا، کلیۃ الآداب، 2003ء، ص 422-423؛ الذہبی، التفسیر والمفسرون، ج ۱، ص ۸۳، ج ۲، ص ۱۹۰-۱۹۱؛ الزرقانی، مناھل العرفان، ج ۲، ص ۵۰
64۔ موجز دائرۃ المعارف الإسلامیۃ، مادۃ تفسیر، ج ۸، ص ۲۳۲۰
65۔ امین الخولی، دراسات اسلامیۃ، ص ۲۴۔ اسی بارے میں شیخ محمد رشید رضا نے یوں کہا ہے: "وقد عرفت أن الإکثار في مقصد خاص من ھذہ المقاصد یخرج بالکثیرین عن المقصود من الکتاب الإلھي، ویذھب بھم في مذاھب تنسیھم معناہ الحقیقي" (محمد رشید بن علی رضا، مقدمۃ تفسیر المنار، ج ۱، ص 18، 24-25) اس طرح کے دیگر مقاصد میں سے کسی ایک خاص مقصد میں بہت زیادہ پڑنے سے بہت سے لوگ کتابِ الٰہی کے اصل مقصد سے بہت دور نکل جاتے ہیں، اور ایسی راہوں پر جانکلتے ہیں کہ قرآن مجید کے حقیقی معانی بھی بھول جاتے ہیں۔ اسی ضمن میں شیخ محمد رشید رضا نے تفسیر کو دو مختلف اقسام میں تقسیم کیا ہے: (۱) ایک قسم وہ ہے جو کہ اللہ تعالیٰ اور

کتاب اللہ سے دور لے جاتی ہے، اس کا مقصد صرف اور صرف الفاظ کو حل کرنا اور جملوں کی ترکیب کرنا، عبارات و اشارات کی فنی باریکیوں کو بیان کرنا ہے، اس طرز کی وضاحت کو تفسیر کا نام دینا بھی جائز نہیں، یہ در اصل نحو و صرف اور الفاظ معانی کی مشق کے مترادف ہے۔ (۲) جب کہ تفسیر کی دوسری قسم کا اصل مقصد قرآن مجید کا فہم حاصل کرنا ہوتا ہے کیونکہ اس میں لوگوں کو دین اور دنیا کی کامیابی کی طرف راہ ملتی ہے اور یہی تفسیر کا اعلیٰ مقصد ہے۔ اس کے علاوہ جتنی بھی ابحاث ہیں وہ حقیقی تفسیر تک پہنچنے کا ذریعہ ہیں۔ (محمد رشید بن علی رضا، مقدمۃ تفسیر المنار، ج۱، ص17، 19)

66۔ امین الخولی، التفسیر معالم حیاتہ، ص19-20؛ ڈاکٹر فہد الرومی، اتجاھات التفسیر، ص589

67۔ امام الذہبی، التفسیر والمفسرون، ج۳، ص140

68۔ عبد اللہ بن عبد اللہ الاہدل، التفسیر العلمي للقرآن الکریم، ص۱۵؛ اتجاھات التفسیر، ج۳، ص۱۲۱۹

69۔ ڈاکٹر امین الخولي، التفسیر: معالم حیاتہ، ص25-26

70۔ امین الخولی، دراسات اسلامیۃ، ص۲۴

71۔ ایضاً، ص۲۳۰

72۔ ایضاً، ص۲۳۶

73۔ امین الخولی، مناھج تجدید، ص۲۲۶؛ فن القول، ص۲۳۸

74۔ امین الخولی، مناھج تجدید، ص۱۶۶، ۲۲۶، ۲۶۷؛ فن القول، ص۲۳۹

75۔ امین الخولی، فن القول، ص240-241

76۔ ایضاً، ص۲۴۵

77۔ ڈاکٹر محمد عبد المطلب، البلاغۃ والأسلوبیۃ، قاہرہ، نوبار پرنٹنگ ہاؤس، ۱۹۹۴ء، ص۱۲۸

78۔ محمد محمود حجازی، الوحدۃ الموضوعیۃ فی القرآن الکریم، مصر، دار الکتب الحدیثۃ، ۱۹۷۰ء، ص۱۳

79۔ بحوالہ: عبد اللہ محمود شحاتہ، منہج الأمام محمد عبدہ، مصر، اسماعیل الجیلانی الرمشی، 1984ء، ص۳۶؛ ڈاکٹر فہد الرومی، منہج المدرسۃ العقلیۃ، ص۲۲۳

80۔ امین الخولی، دراسات اسلامیۃ، ص۴۰-۴۱

81۔ بنتِ الشاطئ، التفسیر البیاني، ص۱۸

82۔ امین الخولی، دراسات اسلامیۃ، ص۴۰

83۔ امین الخولی، دراسات اسلامیۃ، ص۴۱

84۔ الزمر ۳۹:28

85۔ امین الخولی، دراسات اسلامیۃ، ص۴۲

86۔ البقرۃ ۲:۱۸۵

87۔ امین الخولی، من ھدي القرآن في رمضان، مصر، الھیئۃ المصریۃ العامۃ للکتاب، 1987ء، ص126-127

88۔ ایضاً

89۔ الحدید ۵۷:25

90۔ الأعراف ۷:26

91۔ الرعد ۱۳:17

92۔ النبأ ۷۸:14ا

93۔ المائدة ۵:114ا

94۔ امین الخولی، من هدي القرآن في رمضان، ص127-128